من میں جمی برف

ڈاکٹر شبنم عشائی

من میں جمی برف

ڈاکٹر شبنم عشائی

من میں جمی برف

ڈاکٹر شبنم عشائی

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

یہ کتاب جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کی جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

MAN MẸ'N JAMI BARF
by Dr. Shabnam Ishai
Edition : 2013
Paper Back — ₹ 300/-
Hard Bound — ₹ 400/-

نام کتاب	:	من میں جمی برف
مصنفہ وناشرہ	:	ڈاکٹر شبنم عشائی
پتہ	:	عشائی منزل تاپر، پٹن، کشمیر
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق تزئین	:	اظہار احمد ندیم
زیر اہتمام	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ملنے کے پتے	:	
	:	کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی۔6 011-23276526
	:	بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
	:	راعی بک ڈپو، الہ آباد

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi -110095 (INDIA)
Mob: 9971775969, 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail

Book Setting at : Frontech Graphics, 9818303136

انتساب

اُس مٹّی کے نام
جو مجھے
پناہ دے۔

فہرست

پیش لفظ

میں اور میرا اکلاپا
گواہ ہیں اس بات کی
جو للا یا پلا تھ
گزری ہوں میری آنکھوں سے
جو گزری ہے
وہ دہشت ہے
جینے والوں کی
شاطروں کی سیاست کی!
دہشت سے
ہانپتے کانپتے
دفتر میں پناہ لیتی ہوں
وہاں بارہ منھ چہروں کے بیچ
میں ایک چہرہ لیے

اکیلی پڑ جاتی ہوں

بے سروپا

ایک غار میں کود پڑتی ہوں

اور زندگی کا

چلّہ کاٹتی ہوں!

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہاتھ تمہارے
جاگیرداری کے تانے بانے میں
یوں الجھے تھے
کہ مجھے تمہاری
ایک انگلی
میسر نہ تھی
جس کو پکڑ کر میں
چھوٹے چھوٹے قدم لینا سیکھتی
توتلی زبان میں کچھ بولتی
جو صرف تم سمجھتے!
اب میں ہوا کی انگلی پکڑے
خیال کے سنگھ چل رہی ہوں
پر میری زبان سے گرے
توتلے لفظ

اب بھی
اُس کوٹھی کی دہلیز پہ
پڑے ہوئے ہیں
جہاں باغوں سے سیبوں کی خوشبو
مجھے ڈھونڈنے
روز آتی ہے...........
جہاں روپیلی دھوپ
مجھے کھوجتے ہوئے
کوٹھی کی
منزلوں اور محرابوں سے ہو کر
صحن میں کھڑے
سرو کے باوقار پیڑ سے
ٹیک لگا کر
میری راہ تکتی ہے......
پر لاسمتی کے سفر نے
مجھے روندھ ڈالا ہے

تو ڑ دی

نظم تو ڑ دی تم نے
پَو پھٹتے ہی میرے ساتھ چلی تھی
Tred mill پہ
دوڑ رہی تھی میرے ساتھ......
آٹا گوندھتے گوندھتے
سلبٹے پہ مصالحہ پیستے ہوئے
کچن سے بھی
ساتھ نکلی تھی میرے!
Shower لیتے ہوئے
سانسوں میں چھپایا تھا
میں نے اُسے!
شرنگار کرتے ہوئے
ہونٹوں کو اسی کے رس سے
رنگا تھا میں نے

ناشتے کی میز پر
میرے ساتھ وہ بھی
چائے کی چسکیاں
لے رہی تھی!
سفر میں بھی ساتھ چلی تھی میرے
دریا پار کرتے ہوئے
کشتی میں میرے سنگ
ڈول رہی تھی
دفتر میں بھی
میری انگلی پکڑے
زینہ زینہ چڑھی تھی
توڑ دی
نظم توڑ دی تم نے
شام دفتر سے
کس کے سنگ
گھر جاؤنگی؟
توڑ دی
نظم توڑ دی تم نے!

نظم کیل پہ
ٹانگ کے آئی ہوں
کہ نا آشناؤں کے ہجوم میں
کوئی تو شناسا ہوگا
جو میرے شانے پہ ہاتھ رکھے
اور کہہ دے
تم سے بچھڑ کے خود سے بچھڑ گیا ہوں!
افسوس کہ شناسا سارے
جذباتی دیوالیہ پن کے
شکار ہو گئے ہیں!
پر تعجب ہے کہ یہ سب
جذبوں کی نمائش لگا بیٹھے ہیں

چل

اے مسافر من چل
نظم کو کیل سے اتار لے
اور کان میں اسکے کہہ دے
کہ تم سے بچھڑ کے
خود سے بچھڑ گئی تھی!

میری لکنت
اُس قلم کی زبان ہے
جس کو
تمہاری انا نے تراشا
اور یہ جو گونج ہے؛
میرے وجود کے
ٹوٹنے کی آواز ہے
کوئی Feminism نہیں
بس
بے حیثیتی ہے!

برف باری
جیسے دھرتی پر نہیں
میرے من میں ہو رہی ہے......
کیا تم نے برف کو
کسی من میں جمتے دیکھا ہے؟
جمی ہوئی برف پر
کھلاڑی
پھسلن کھیلتے ہیں!

من

ملال کے شہد میں ڈوبا

انگھوٹا چوستا ہے!

رشتوں کی بے رنگی

گھر کے

در و دیوار پہ

رینگ رہی ہے!

خوف کا بوسہ

محبت کے ہونٹوں پہ

پپڑا رہا ہے

اور تم

بجلی جیسے کوندھ رہے ہو

اس خوفناک عالم میں.....

جو میری دستک سنتے

ابڑ کھابڑ رستے

ہمیں

یوں نہ دھنتے

دھنتے دھنتے

ہم کتنے ہلکے ہو رہے ہیں

جیسے روئی کے گالے!

کیا تم

اِس عمل سے تھکے نہیں؟

دھونی کے تار ٹوٹ رہے ہیں

...........آؤ ذرا

چاہت کی اِک انگڑائی لیں

بنا بوجھ کے من

شاید

کچھ سجدے بچھا سکیں

درد کی آنکھ سے ٹپکا ہوا
میں وہ آنسو ہوں
جو
زندگی کے چہرے سے اتر کر
شہہ رگ پہ رُکا
ٹھنڈا پڑ رہا ہے !
ذرا اپنے گرم ہونٹ
میری حلق پہ رکھ دو
اپنی زبان سے
میرا نمک چوس لو
مجھے پانی کر دو!

اُداس مت ہونا

نظم

مجھے بس سوچ رہی ہے

پر میں

تمہاری دہلیز پر

دیپک کی طرح جل رہی ہوں......

نظم کو تحویل میں دینے سے پہلے

میرا 'میں'

جانے کب تلک

تمہارے سجدے میں تھا

وہ تو سر اٹھانے پہ کھلا

کہ 'تم' تم میں نہیں تھے!

اس صدمے میں

میں نے میرے 'میں' کو

نظم کی تحویل میں دے دیا تھا

اُداس مت ہونا

تم جب بھی آؤ

مجھے

جلتا ہوا

اپنی دہلیز پہ پاؤ گے...

انگ انگ

تم سے لبریز ہے
تم سمجھتے نہیں
فیصلے لے لیتے ہو
تمہارا کوئی فیصلہ
میری حلق سے
نہیں اُترا؛
پر میرے حلق نے
نگل لی ہے
میری زبان!
ذہن کے جال میں تمہیں
من کے سخن
کون بتائے گا؟

ہاں کان خالی ہیں
روبی نیلم موتی
بس غم میں جڑتی رہی
گلے میں نولکھا نہیں غم تھا
کسی چاہت کی انگڑائی میں نہیں
بن باس میں تھی..........
کان خالی ہیں من بھرا ہوا ہے
درد سے
درد
بن باس میں بھی نہیں کٹا
جاگتا رہا
تمہارے اندیشے میں!

شک وشبہ کی کھرونچوں سے
وفا کا چہرہ
برباد نہ کرو
وفا خدا کے صحن کا پھول ہے
تم نے ویرانوں میں
بے اعتباری کے ناخن
بہت بڑھائے ہیں
معلوم ہے
درد کی شبنم
ہر صبح
اعتبار کا مصلیٰ بچھاتی ہے
............ایک لمحہ
مقدس جی لو
وفا کا سجدہ کرلو

تم پاس تھے
میں اپنے ساتھ رہ رہی تھی
تم چلے گئے
تو ہر پل
تمہارے ساتھ گذرنے لگا
اس بات کی گواہ
وہ سوندھی مہک ہے
جو وفا کے آنسوؤں سے
من کے بھیگ جانے پہ
پھیلتی ہے
ہر شام...........

تمہاری دغا
میری خطا ہے
ریت کے ٹیلے پہ
کوئی عمارت بنتی ہے کیا؟
وفا کی نیو
من کی زمین پہ ڈلتی ہے
کیا تم نے کبھی
من سے سوچا ہے؟
کسی من کو
دغا کی ریت سے
بھرتے ہوئے دیکھا ہے؟

آنکھ مسلسل پھڑک رہی ہے
وہ بھی دائیں!
کیا کوئی الزام بچا تھا
جواب لگنا ہے؟
جھوٹے الزام
میری اوڑھنی کے
چاروں کونوں میں
باندھ دیئے گئے تھے
جب میں تمہیں
خرید رہی تھی
تم کو تو ہار چکی ہوں
آنکھ کیوں پھڑکتی ہے؟

اے دکھ

میں کوئی لفظ نہیں

اور نہ کاغذ ہوں

جو تم مجھ میں

بار بار پناہ لیتے ہو

مقروض ہوں زندگی کی

اور تم سے بھر گئی ہوں!

تو ہی بتا اے دکھ

زندگی کا قرض

کون اُتارے گا

من بھر

تمہاری سکونت ہے

کیا تم نے
تنہائی کی برف باری میں
رستوں کا گم ہونا دیکھا ہے؟
سب کچھ
اوجھل ہو جاتا ہے
نظر سے!
زندگی بھی......
تنہائی کی برف باری میں
جب برفیلی دھند
من کو
سُن کرتی ہے!

میں بھی
تمہارا صرف
استعمال کر سکتی ہوں
اور تم بھی
میری طرح
بے وقعت ہو سکتے ہو
جو تم
میری حیثیت کو
نہ سمجھو

میں نے انگلی نہیں

من سونپا تھا

تم نے رشتہ

انگلی کو پہنایا

من کا سناٹا

انگلی کا ہاتھ پکڑے

پرچھائیاں چنتا ہے

آوازیں بجھنے پر بھی

من کیوں رشتے بنتا ہے؟

کیا تمہارے من کے ہاتھ نہیں

جو دل کے سناٹے

کھول دیں
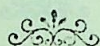
دل کی دھڑکن پہ ذرا
اپنا سیک سا ہاتھ رکھ دو
دُکھ بری باتوں کی کپکپی
شاید کچھ کم ہو
تم تو بس
بہتے پانیوں کو تکتے ہو
لاؤ سوچ کے گھبرا جانے سے پہلے
سارا وہم
تمام خوف
ڈل میں بہا دیں
ڈل کے جم جانے سے پہلے
میں تمہاری خوشبو میں
تیرنا چاہتی ہوں!

ایسے بکھرے
جیسے کوئی کتاب
ورق ورق ہو گئی ہو
سارے پتوں پہ
اب اکھشر ہی اکھشر ہیں
کچھ عطر ہے
تمہاری یاد کی
جو من کی خالی سرائے کو
گیارہ مہینے مہکاتی ہے
مارچ کے انتظار میں!
بارہواں مہینہ مارچ کا
موسم عشق!
ویسی ہی رِم جھم
ویسی ہی پھواریں
ویسی ہی برکھا

پر نہیں معلوم
اب موسمِ عشق
میرے من میں اتنے آنسو
کہاں سے لاتا ہے
کہ میرا
خدا بھی بہہ جاتا ہے

سُن
تو بھی فقیر
جیسے وہ
پھر کیوں لکھے
خدا جدا؟
خبط میں دل کیا
قلم بھی
بے قابو ہو جاتا ہے
کتنے برس قابو کئے
اُس نے
وفا کی چاہ میں!
رانی تھی وہ پر فقیر تھی
روتا ہوا بادل بھی
پلک بند کئے
گفتگو کرتا تھا اُس سے

فقیرانہ صدا اُس کی
سات سمندروں سے
تمہاری بُو چُرا کے لاتی
اِک سرائے
تیرے کاکل سے بناتی
اور دیر تلک
نیند گنواتی!
اب جگ رہی ہے کہ جگتے جگتے
کسی آنکھ میں سو گئی ہے
خدا سے اکثر
بولتی ہے!

ایسی ہی رِم جھم
ایسی ہی پھواریں
ایسی ہی برسات تھی
تم نے تھوڑا سا دل
میں نے تھوڑا سا غم بو دیا تھا
دونوں کا سازِ سخن
ایک دوجے سے
روشن تھا
موسم عشق تھا
دونوں نے باب محبت کھولے
شب بھر
محبت کی آیات پڑھیں
وصل کے پھول چنے!
صبح پھولوں پہ
شبنم کی بوندیں

سرسرانے لگیں کہ
کواڑ پہ
زمانے کا چھل
دستک دے چکا تھا!

ہم محبت اور تم
دل آزاری کرے ہو
قرب کی خیرات
رائیگاں کرے ہو......
ذہن کے ہُنر میں سرشار
نغمۂ دل بھلا بیٹھے ہو
دل کے دھڑکنے کا ہنر
رائیگاں کرے ہو......
حزن وملال کے پردے کو
ہٹا کے تو دیکھو
اپنائیتوں کی سیک کو
رائیگاں کرے ہو......
محبتوں کی برسات میں
بھیگ کے تو دیکھو
حسن کی سوغات کو
رائیگاں کرے ہو......

تمہاری مانگ میں
تہمت کا سندور
کون بھر گیا؟
تمہارے آنسوؤں میں
کس کی ہنسی بہتی ہے؟
جھوٹ کی حکمرانی میں
سچ کا کہیں دفتر نہیں
جہاں کوئی
اپنے عمل کی File کھولے
یا مزاج کا
نبض پرکھے
معلوم ہے
وہ تمہاری بینائی کو
انگوٹھی کے نگینہ میں لگوا کر
پہن رہا ہے
تم اپنی بے نور آنکھوں سے
سچ کا دیدار کیسے کرو گی؟

کرفیو زدہ شہر کی

بیوہ سڑکیں
آنکھیں کھولتی ہیں
نگر کے گربھ میں
کیا دیکھتی ہیں نہیں معلوم
حیرت زدہ ہیں!
دھرتی شاید
گربھ دھارن
کر رہی ہے
چاند چھپ کر
کھڑکیوں سے جھانکتا ہے
آوارہ کُتے
ٹولیوں میں بھونکتے ہیں
زندگی
برہنہ سو رہی ہے

میں

رات سی کٹ رہی ہوں

پوری وادی میں

کرفیو نافذ ہے

میری بے گھری کو
جو تم نے پناہ دی تھی
میں تمہیں
تخم جیسے
من میں بو رہی تھی......
میری جان
بے وفائی کی
جو تم نے ٹھان لی ہے
الزام کا Over coat
مجھے
کاہے کو پہنا رہے ہو؟
بے وفائی کا سایہ
تمہیں مجھ میں
اُگنے نہیں دے گا
پر تم میرے من میں
پھوٹ چکے ہو!

میری جان
اب بھی میں تمہیں
سینچ رہی ہوں......
اگنے دیتے خود کو
میرے من میں
کونپلیں کھلتیں
پھول مہکتے
وفا کی خوشبو سے تیرے مرے چاک سلتے
گھر کے
درو دیوار چہکتے!
الزام کا Over coat پہنے
میں
رات سی کٹ رہی ہوں
پر میری ہر صبح
تمہاری دہلیز پہ کھلتی ہے
میری جان

بے وفائی کی
جو تم نے ٹھان لی ہے
ذرا سوچ لو
تیرا خالی خالی گھر
میرا خالی خالی من
کیسے کیسے بھیانک جالوں سے
بھر جائیں گے!

کیوں جڑا اُن آنکھوں میں

آنسوؤں کی جگہ خواب

جو خواب نہیں

آنسو پالتے پالتے

بوڑھی ہوگیئں تھیں!

خواب جو کہیں ٹھہرتا نہیں

چشم در چشم سفر میں رہتا ہے

وہ اس کو

اپنی پلکوں کی اماں میں رکھ رہی ہے

باوَلی ہے !

خواب جب اس کی نظر کو خالی کردے گا

اس کی آنکھ کی اجڑی وادی میں

کچھ نہیں بچے گا

آنسوؤں بھی نہیں

اور تم

تم کسی خواب کے سنگ نہ جانے
کس نگر پہنچ گئے ہونگے

باؤلی ہے!

ترکِ تعلق

میری انا نہیں
تقصیر ہے
تقصیر بس اتنی
کہ میری نسوں میں دوڑتا لہو
گھوس سے نہیں
پسینے سے بنا ہے
اِک راجہ کے!
راجہ نے جانے کب
جذبات کو
اصول پرستی کے قبرستان میں
گاڑھ دیا تھا
اور میں!
محبت اُگا چکیں تھی
جو بے بسی کے قہر میں

آواز نما خاموشی بنکر

میرے وجود کے گنبد میں

گونج رہی ہے!

......ذرا روح کے تار ہلا

غور سے سن

اُس وجود کو جس کا انگ انگ

تجھ سے لبریز ہے!

سڑک پہ کتا
کوڑے کے ڈھیر پہ ایسے بیٹھا ہے
جیسے میں
زندگی کی راکھ پر!
پر وہ سو رہا ہے
شاید باخبر ہے
کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا
اُس کے پاس
صحن ہوتا نہ چھت!
کرفیو نے شہر کو نگل لیا ہے
بادل کی آنکھ بھر آئی ہے
میری آنکھ
تیسری منزل سے
ہمسایے کے بڑے صحن میں
جھانک رہی ہے......

دادا قبر میں
آرام سے سو رہا ہے
پاس میں
جاگیردارن دادی بھی
قدم پسارے ہے
اُن کی ناموجودگی نے
میرے وجود کو
کب یتیم کیا
پتہ نہیں!
کرفیو کے سنّاٹے میں
شہر کے چھوٹے نکڑ پہ
صحن تراشتے
میں سوچتی ہوں
کتنا سمجھدار ہے!

نہ سونے پہ ترنگ
نہ چاندی میں
کوئی کھوٹ نکالی
نہ کسی کی کبھی
توہین کی
نہ کسی پہ کوئی
بہتان لگائی
......زمانہ سازی کی نہیں
کبھی کسی موقعہ کو
نچوڑا نہیں
سو بے وقعت ہوں
feminist نہیں

اگر تم اپنی پلکیں
میری آنکھوں پہ رکھ دیتے
نیم تاریک راہوں میں
وہ چھت کو
درو دیوار کو تکنا
چھوڑ دیتیں!
میں
یاد اور سوچ کے عذاب سے
فرار پا کر
تم میں چھپ جاتی!
مجھے کبھی بھی
خود کو بچانا نہیں آیا
نہ رات کے اندھیرے میں
اور نہ دن کے اجالے میں
دن کے اجالے میں لوگ

کھو کھلے لفظ

اتنی مہارت سے برتتے ہیں

کہ سچے لفظ

توہین میں

میرے ہونٹوں پہ آنا

ترک کر دیتے

رات کے اندھیرے میں

تم

میری آنکھوں میں جاگتے ہو

اور نیند

میری آنکھوں میں آنا

ترک کر دیتی ہے

تمہیں

محبت کرنا

ترک کر دینا چاہیئے تھا!

محبت فرار نہیں

سخاوت ہے

تمہارا جسم

تمہارے من کے فرار سے

شاید واقف نہ تھا

لیکن میری

لاکلامی اور بے خوابی

میرے من سے واقف ہے

کہ اگر تو

اپنی پلکیں

میری آنکھوں پر رکھدے

تمہارا سارا فرار

میری پلکوں کی پگڈنڈی سے

میرے اندر اُتر آئے

تُو کدورتوں سے پاک

سخی ہو جائے

اور

محبت کر پائے......

جب میں
تمہاری دہلیز پہ
وفادار کتا سا
ہانپ رہی تھی
تب تم نے مجھے
اپنے احاطے سے
باہر کھدیڑا تھا......
تم
خمار کے رنگ محل میں اب
دغا کی وباء سے منتشر
مجھے کیوں بُلا رہے ہو؟

میں کس کی بیٹی ہوں
میری آنکھوں میں
نہ کاجل ہے نہ کوئی سپنا !
سپنے Lux کی ٹیکیہ تھے
جیون ساگر کی اگنی میں
پگھل گئے......
کاجل میں نے کہاں رکھا ؟
ماں نے اپنی شادی کی
اِک چاندی کی ڈبیہ
دی تو تھی؛ کاجل بھر کے
یاد ہے مجھے
ماں اکثر
کپاس کے پھول سے روئی لیکر
ہلدی اور بالنگو گوندھ کے
اِک باتی بناتیں

باتی شب بھر مکھن میں جلا کے
صبح
شیتل کاجل
آنکھوں میں لگا کے
رنگ محل کی گدی پہ
سپنے پروتیں!
میں کس کی بیٹی ہوں
میری آنکھوں میں
نہ کاجل ہے نہ کوئی سپنا
کاجل میں نے کہاں رکھا؟

آنسو نہیں
نظم ہے
نظم بھی نہیں
شاید تم ہو
تم سے
چشم میری تر ہے
قبر کی مٹی سوکھ رہی ہے....

من موہک، متوارا
وہ اِک
میٹھی آنچ تھا......
کہتا تھا
''میں'' کاجل ہوں
سپنوں کے بٹے سے
عشق کی سِل پہ
نیندیں پیس پیس کے
بنا ہوا............
......شاید کسی نے آنکھوں میں
رکھا نہیں
قبر میں چھپ گیا !
حُسن اب
کس کے دم سے
سنگار کرلے گا؟

اب کس کے دم سے موسم

درد، مسرت، جدائی

یا وصل کے

نغمے گائے گا......

وہ سب کہاں سے لاؤں
کہ تجھ سا تراشوں جسے
وہ جل ترنگ سا من
جس سے
بے قراری کو سہلانے والے
نغمے پھوٹتے!
عشق کی اوس میں بھیگی
وہ شیریں آواز
کس ساز سے نکلے گی......
سکر کی وہ روپہلی دُھند
وہ ڈھیر ساری چاشنی
شہد کے
کس چھتّے سے نکالوں گی......
پری زادوں سے معصوم
تمہاری محبتوں کے رنگ
کس دھنک سے مانگوں گی......

دلہن کو

خاندانی نولکھا پہنا تو دیا تھا

پروہ گلے میں

سانپوں کے ہار لائی تھی

جو ڈس گئے شادیانے کو

پھر جو نغمے بپھرے

حویلی کے ستونوں کو

گلے لگا کے چیخنے لگے......

حویلی کے خرابوں کے مکین

غبار سا بکھر رہے ہیں

یاباری

کہیں حویلی کھنڈر نہ ہو جائے!

Mike تو حیلہ ہے
دستورِ حیات کا
وجود سارا
دُکھ کی بیل میں
جکڑا ہوا ہے
من کے لب بھی ہلیں
تو بیل
مر جائے گی!

انڈے کے کھول میں
بند کر کے رکھا ہے
مجھے اُس نے
محل، صحن
چھاؤں تمازت
گلاب وسمن
جس کو
سونپ کے نکلی تھی!
......دبکی سہمی مبہم سی
کھول میں پڑی
سنّاٹا ہو رہی ہوں
نہ کوئی کرن
نہ اِک سانس......
یا باری
دیو کا یہ جو سایہ ہے

پاک کردو
یا پھر مجھے
مکمل خاک کردو

نصف ہوں

آدھا کہاں ہے......

کیسی ہوا چلی

نصفؔ نصف ہو گیا!

نصف زخم ہے

زخم کی مرہم بن......

نصف سے جو نصف

آنکھ چرائے

گالی ہے!

سالم کلمہ ہے

عشق
من کی سرگوشی میں ہے
میں من کے ہونٹوں پہ
اپنے ہاتھ پھیرتی ہوں
کہ عشق چھولوں......
عشق آنسوؤں کی نمی میں ہے
Tissue paper آنسوؤں کی نمی پی رہا ہے
عشق پیاسا ہے......
تُو جھرنا بن جا
دہکتے لفظوں سے آگ نہ بھڑکا!
دہکتے لفظ
میرے سپرد کردے
میں مٹی ہوں
لفظوں کا زہر پی سکتی ہوں
عشق پیاسا ہے
تُو جھرنا بن جا......

ذرا اپنے پیروں سے
ہوا کے جوتے اُتار
زمین کی محفل میں قدم رکھ
اور دیکھ
دیکھ تمہاری اڑان نے حیات کو
آرزو سے کیسے خالی کر دیا ہے.....
ہوا کے جوتوں میں بے خبر
پیروں نے
کتنے پھول مسلے ہیں
کتنی اذیتوں کو جنما ہے......
ذرا اپنے پیروں سے
ہوا کے جوتے اُتار
اور دیکھ
...... ایک نگاہ
محبت کو دیکھ

محبت کے سینے پہ کُندہ
اپنے جوتوں کے نقش دیکھ
دیکھ ذرا
دم بخود محبت کو دیکھ!

مجھے تھام لو
ڈیہہ رہی ہوں میں
ناامیدی کے
گہرے پانیوں میں !
بہت ساری
تند و تیز موجوں کی صدائیں
اپنے اندر سمیٹے
ڈیہہ رہی ہوں میں
مجھے تھام لو
بحث نہ کرو
پل بھر
دل کی سنو
اداسیوں کا سنگھار
ڈھل جائے گا
مجھے تھام لو......

وہ ریگستان میں
دھوپ سینک رہا ہے
کہ شُمار کر رہا ہے
زمین میں اُبلتے
محبت کے چشموں کا

یہ
طے کرنا بھی
ایک دُکھ ہے!

لب میرے تکتے ہیں تجھے
زبان پہ لانے کو
کیوں گونگی دُھن بنے
میرے سینے میں
اٹک رہے ہو ؟
میں کوئی
ٹوٹا ساز نہیں
راگ مالا ہوں
تم
من چاہے پنوں سے
سُر
چن سکتے ہو !

تمہاری گفتار کے کانٹوں میں
الجھی ہوئی ہوں
Feminist نہیں
لحظہ بہ لحظہ
محبت ہوں
تم نے کبھی
اپنا آپ
محبت کے ہاتھوں میں
سونپا نہیں
اور میں
Feminist ٹھہری؟

نہیں تاب لا رہی ہوں
تلخ گوئی کے زخموں کی....
نہیں تاب لا رہی ہوں
اشک بار لمحوں کو
سہلانے کی......
نہیں تاب لا رہی ہوں
وفا کی پشیمانیوں کو
گُد گُدانے کی......
مجھے بجھا دو
ہاں بجھا دو مجھے......

تمہارے کھونے کا ماتم ہے!

قبرستان سی خاموشی

اور میں...........

خاموشی کے زنگ میں

سخن سڑ رہے ہیں

زبان

اپنایتوں کے ذائقے سے ناآشنا

سُن ہو رہی ہے...........

دو بول محبت کے کہنے سے رہ گئی

سب کچھ رہ گیا.................

کندہ کاری کف گیر

زعفرانی ترکاری

پرونے سے رہ گئے!

کنگن میرے ہاتھ نے نہیں
خواب نے دیکھے ہیں
میرے ہاتھ
من کے کان بنے
خواب کی کھنک سنتے ہیں
پَر ہاتھ کی لکیریں
روشنائی سے
کنگن کا ذائقہ پوچھتی ہیں!

اُداسیوں نے
من کے گرداگرد
اِک دھواں سا لپیٹ دیا ہے
کالا دھواں ؛ رو پیلا دھواں
دھویں میں کچھ سوز ہے
چھُوٹے رشتوں کی صدا کا !
دھویں میں کچھ نور ہے
پرائے اپنوں کے چہروں کا !
سوز و نور کی دُھند میں
جگر اپنی آنکھیں موند رہا ہے
.................میں
من بھر دھواں پی لیتی ہوں
کسی چارہ ساز کی حاجت نہیں
گاتی ہوں.................

زندگی کے تانڈو میں
جو بانہوں سے کھو گیا تھا
اُمید کی چپ میں
کھنک رہا ہے......
خالی بانہیں
امید کا جھولنا بنے
تانڈو کو تک رہی ہیں
انتظار
غریباں چاک کئے ہوئے ہے
شبنم
آنسو شمار کر رہی ہے

نیا فریب

ابھی کچا ہے
من کے سانس لینے پہ بھی
رِستا ہے !
کچے مٹکوں کا انبار
بھٹی میں تپنے کے انتظار میں
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے
آگ تمازت ہی نہیں
کالک کا داغ بھی دے سکتی ہے !
اعتقاد کا داغ
ماتھے پہ لگ جاتا ہے
اُس نے میرا ماتھا توڑ کے
اعتقاد کو پٹخ دیا............
یا باری اب
بے اعتقادی کے مٹکوں میں

یقین کہاں سے بھر دوں؟
ٹوٹے ہوئے ماتھے کو
کس مٹی سے جوڑ دوں؟

ناامیدی کی روندھی ہوئی
تمہیں اب
امید کی کیا حاجت
جو درویش کے در پے
تمہارا سورج طلوع ہو
اور فقیر کی قبر پہ غروب!
وقت جب تمہارے ہاتھ سے گرا تھا
چکنا چور ہو کے ملبہ ہو گیا تھا

امید
اُسی ملبے میں کہیں دفن ہے
اعتماد کے فریب میں
کب تلک
امید ٹٹولو گی ؟

پچھلی شب خواب نے

اُمید کو جگایا!

رات بھر

اُمید کی بکھری زلفوں کو سلجھایا

وفا کی عطر سے نہلایا

ٹوٹی لڑیوں کو

چاندی کے پراندے سے گوندھا

پھر تمنّا کے

سارے تارے ٹانکے۔۔۔

صبح اُمید کی انگلیاں

اپنی سونے جیسی

زلفوں کا سلجھاؤ

ٹٹولنے لگیں۔۔۔

خواب

سب کچھ کر ڈالتے ہیں

وہ بھی
جو کوئی نہیں کر سکتا
کیا خواب
بے خبر ہیں؟

تمہیں کیسے دکھاؤں وہ غبار

جو فریب نے

میرے من میں اڑا رکھا ہے !

آنکھیں موندھتی ہوں

تمہارا چہرہ تلاشتی ہوں......

..........ملال میں بہہ نہ جاؤ

فریب زدہ ہوں

.....................یقین سا

میرے دل میں سما جاؤ !

مصیبتیں

جو تھکن

میری جان میں چھوڑ گئی ہیں

وہ میں تمہیں

کیسے دکھاؤں ؟

حیلۂ بے وفائی کے انبار

رہنے دو

بس تھکاوٹیں ہیں

مصیبتوں کی !

پو پھٹتے ہی
وہ میرے کمرے میں آئی
اور اپنے پاک ہونٹوں سے
چوما میرا ٹوٹا ماتھا
ہونٹوں کی اوس
ماتھے سے بھیتر
میرے من میں اُتری
گھور اندھیرے میں
اِک کرن سی
روشنی کی چمکی............
''تش نار'' کو نش تار
Tooth paste کو
ٹوش پیسٹ
اشرف کو اشفرا
کہنے والی باشی عشائی

ٹھنڈ لگتے ہی کہتی ہے
"مجھے ٹھُر ٹھُر لگ گئی"
آج اسکو
میرے ساتھ چلنے سے روکا گیا
.................میرے من کو
ٹھُر ٹھُر لگنے لگی !

بارش رُک گئی
مصرعہ میرے گلے میں اٹکا ہے !
تمہاری کینہ پروری
جگر میں اٹکی ہے
یہ وہی جگر ہے
جو تم سے لبالب تھا............
ذرا لُٹے جگر کی اور پلٹ کر دیکھ
اپنے ویران مسکن پر نظر کر
انا کی ارزش میں
کب تک نابینا بھٹکو گے؟
کب تلک مصرعوں میں مبہم سے
ہُمکتے رہو گے ؟
وہ جو چشمہ سا پھوٹا تھا
سات رنگوں کا
دھنک کے جگر میں

سما گیا ہے ......
بارش رُک گئی ہے
مصرعہ میرے گلے میں اٹکا ہے!

دغانے مجھے
تہ نشین رکھا......

میرے حوصلے

میری وفا

مسرتیں ؛ عشق اور خواب

تہوں کے بیچ راکھ ہو گئے !

میرے چاپ کی زبان دب گئی......

زندگی دبتی نہیں ؛ مجھے دھڑکا سا لگا ہے !

دغابازوں کو

خدا کا بھی خدشہ نہیں

وہ پانی سے ؛ مٹی سے ؛

ریت سے نہیں

پانچوں وقت
مکاری کی جھاگ سے
وضو بناتے ہیں
اور زندگی کے تانڈو کا
سجدہ کرتے ہیں
میں
سجدے میں بڑبڑاتی ہوں
''اے موت گلے لگالے''
زندگی دبتی نہیں؛ مجھے دھڑکا سالگا ہے !

کسی نظر میں شفا کی
کوئی کرن نہیں
جو جگر کی سوجن اترے !
دریا کا پانی اتر گیا
کنارے سوکھ رہے ہیں
سوکھے ہونٹوں پہ
اوس کا بوسہ
ٹھٹھر رہا ہے......
ٹھٹھرتے بوسے کو
من کے کنارے
محبت سینکنا ہے
مجھے دریا پھلانگنا ہے —
قدم کھو کیوں رہے ہیں؟

اجڑے من کے خلاء میں

کبھی وہم

کبھی خمار

کبھی خوشبو

تو کبھی

آسودہ غبار سا پھیلتے ہو......

......جی کے آزار میں

یہ سب ہوتا ہو ......

پر

اجڑے من کے خلاء میں

......یہ انتظار سا کیا ہے ؟

کاش یوں ہوتا
کہ وفا
من کا فرن چاک کر کے
فرار پاتی !
بخیے اُدھیڑ کر
اودھم جوت کے
من کو چھوڑ جاتی
......انتظار تمام
کٹ جاتے
من کی آنکھ لگ جاتی !

زندگی کی روندھی ہوئی
نڈھال
تمہاری دہلیز پہ
پڑی ہوئی ہوں !
......آواز تھی میں سچ کی
ایک بلبل باغوں کی......
سیبوں کی خوشبو میں بسی ہوئی
اپنایتوں کی خوشبو میں رچی ہوئی......
تخیل کے پروں پر اُڑتے ہوئے
آسمانوں کی نیلاہٹ سے
جانے کیوں مجھے
اُتار لائے تھے زندگی کے جنگل میں ؟
بے پرواہ بھیانک جنگل میں !
زندگی کی روندھی ہوئی

نڈھال

تمہاری دہلیز پہ
پڑی ہوئی ہوں
میرے رینگنے کو قدم بخش دے
یا تو میری بلبل لوٹا دے......

نہیں ڈھونڈنگی تعبیر
خواب کی
تعبیر اگر افتادہ ہو !
خواب نامہ رہنے دو
رفعت بھرا کوئی خواب دیدو......

کس رستے کی
کون سی پگڈنڈی پہ
تم کھو گئے ؟
تمہاری ناموجودگی نے
مجھے جس رستے پہ پھینکا ہے
وہاں سے نہ جانے
کتنی پگڈنڈیاں
روز نکلتی ہیں تمہاری تلاش میں....
ہر پگڈنڈی رَمتے رَمتے
کھو جاتی ہے
خبر کوئی لاتی نہیں
تمہاری
تمہاری موجودگی کو ترس گئی ہوں
تم
میرے کھوئے ہوئے
سب کچھ ہو !

تجھے سلجھاتے سلجھاتے
یوں الجھ جاؤں
ایسا کب سوچا تھا ؟
اب کسی بات کا ادراک کیا
سامع صمی بصری
سب قوتیں بے صلاحیت ہیں !
تمہارے شاخ در شاخ
ذہن کے جنگل میں
پانچ نہیں
میری چھٹی حس بھی
کھو رہی ہے
تم
زندگی کے جنگل میں شادیانے مناؤ
میں
زندگی کے جنگل کا ایک مہلک کھمبا......
زندگی
میری حس سے اوجھل ہے !

محبت کا آخری لقمہ

اسی دستر خواں پہ لیا تھا ہم نے
جو تمہارے انتظار میں
بچھا ہوا ہے اب بھی............
انا کی فرش پہ............
محبت کا دل ٹوٹ کے گر پڑا
قاب نوحے سے بھر گیا
روٹھ کر جانے والے
دستر خواں کو رونق بخشنے سے
تم رہ گئے............
اور میں............
محبت کرنے سے !

غم کی برف باری میں
وفا کا رنگ
نہیں اُترا
وفا کے رنگ میں
بے حد تمازت ہے۔۔۔
لالچ کے الجھاؤ میں
تمازت کی سیک سے
بے خبر تم
جنگل سے پھیلتے رہو
وفا کے رنگ میں
ڈوبی میں
برف سی جمتی رہوں۔۔۔

موت کا جاگراتا
آنکھوں میں کھُب رہا ہے......
میں کیوں لوٹ آئی تھی
موت کی رات سے؛
عشق سے محروم
یہ صبح دیکھنے کو ؟
سورج کی آنکھوں کو
زندگی کا چہرہ نہیں دِکھتا
زندگی کا چہرہ
اپنا خیلا پن
زندگی کی رونقوں میں چھپالیتا ہے
میں موت کا ڈھلکا
کہاں چھپاؤں؟

Belt پہ
سپنوں بھرا بیگ
گھوم رہا ہے
ہاتھ کیسے بڑھالوں؟
انگلیوں کے جوڑ
ریت چھانتے چھانتے
خشک ہو گئے ہیں!
Air hostes کی آنکھوں میں
سپنوں کا کاجل
گیلا تھا............
میری آنکھیں
عشقِ گمِ گشتہ کی
یاد میں
سر پٹختی پھرتی ہیں!
زندگی کی بھیگی ہوئی بھیڑ

سپنے Trolies میں لاد کر

Pre paid گاڑیوں کی جانب

بڑھ رہی ہے

میرے وجود پہ

بے سمتی کی دھند

رینگ رہی ہے

میرے ہاتھ

Air port کی

خالی Troly ہے......

کچھ ڈاکٹر شبنم عشائی کے بارے میں

گجرات (کاٹھیاوار) سے ایک سادھو قسم کے آرٹسٹ جینت پرمار کا گذشتہ کئی دنوں میں متعدد بار فون آیا ہے کہ ڈاکٹر شبنم عشائی نے آپ کو اپنا تازہ شعری مجموعہ دیا تھا اور وہ آپ کی رائے کے انتظار میں ہیں۔ دراصل کسی بھی شریف۔ انز۔ ان کے ساتھ 'ڈاکٹر' کا سابقہ لگا دیکھ کر ذہن میں اس کی جو تصویر ابھرتی ہے اس کے مطابق اس کے چہرے پر نظر کی بارہ نمبر گول شیشوں والی عینک جڑی ہونا چاہئے اور اس کی خشکی پیدا کرنے والی تنقید اور تحقیقی تحریریں اس کے خدوخال سے انتقام لیتی محسوس ہوں۔

شبنم عشائی نے چونکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ہے، چنانچہ انہیں 'ڈاکٹر' کہلانے کا حق ہے لیکن پرابلم یہ ہے کہ وہ اس کی مندرجہ بالا 'شرائط' پوری کرتی نظر نہیں آتیں! میں نے انہیں پہلی بار کلکتہ میں ماہنامہ 'انشاء' کے زیر اہتمام منعقدہ ٹیگور کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں دیکھا اور سنا، پھر شاعری کے سیشن میں ان کی نظمیں سننے کا اتفاق بھی ہوا، مجھے وہ شاعرہ تو لگیں مگر تنقیدی اجلاسوں میں ان کی معقول گفتگوؤں کی وجہ سے انہیں 'ڈاکٹر' تسلیم کرنے پر میرا دل ابھی تک مائل نہیں ہوا۔

مجھے یقین ہے میرے وہ ڈاکٹر دوست میرے ان ریمارکس پر ناراض نہیں ہوں گے جو ہم عصر ادب کے صحیح پارکھ ہیں مگر میں تو ادب کے ان 'ڈاکٹروں' کی بات کر رہا ہوں جن کا رویہ ہم عصر ادب کے ساتھ 'مریضانہ' ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور، میرے اباجی ہر خوش شکل اور ذہین شخص کو بلاتحقیق کشمیری 'ڈیکلیئر' کر دیتے تھے، سو میں نے بھی اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ جو خاتون میرے سامنے ہے اور جس کی ذہانت بھری گفتگوئیں کلکتہ کی ٹیگور کانفرنس میں گذشتہ دو دنوں سے سن رہا ہوں وہ یقیناً کشمیری ہے، تاہم 'اتمام حجت' کے لئے میں نے پوچھ ہی لیا کہ آپ کشمیری تو نہیں؟ بولیں 'ہاں، لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا؟' اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ مجھے کیسے پتہ چلا، سو اتنا ہی کہا کہ

'پیروں فقیروں کی اولاد ہوں، ہم لوگوں کیلئے یہ بہت معمولی باتیں ہیں لیکن اس حوالے سے کبھی غرور نہیں کیا!'

سو یہ خاتون ڈاکٹر شبنم عشائی تھیں، علی گڈھ یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی اور نثری نظم کی اعلیٰ درجے کی شاعرہ! تاہم ان سے ہونے والی یہ ملاقات بالکل ادھوری تھی۔ ان سے میری مکمل ملاقات واپس پاکستان آ کر ہوئی جب میں نے ان کی نثری نظموں کا مطالعہ شروع کیا۔ میں یہ نظمیں پڑھتا چلا جاتا تھا اور پگھلتا چلا جاتا تھا، چنانچہ شبنم کو پڑھتے ہوئے میں اس مسرت اور انبساط کی کیفیت سے دو چار ہوا جو خالص شاعری کی دین ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دکھ اور کرب کی ایک شدید لہر ان نظموں کے بندی خانے سے نکل کر میرے رگ وپے میں سرایت کرتی چلی گئی، شبنم نظم کی ابتداء کے ہنر سے بھی واقف ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس نے اس کا اختتام کیسے اور کہاں کرنا ہے، چنانچہ وہ قاری کو ابتداء سے اختتام تک اپنے ساتھ رکھتی ہے اور جب اس نظم کا کلائمکس آتا ہے تو دوسرے قارئین کا مجھے علم نہیں، لیکن مجھے کبھی یوں لگتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے ایک دم چکا چوند روشنی میں آ گیا ہوں اور کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تیز روشنیوں کے حصار سے نکل کر گھپ اندھیری غار میں داخل ہو چکا ہوں۔

یہ دونوں متضاد کیفیتیں مجھے ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ میں سب نظم گو شعراء کی بات نہیں کرتا لیکن ان کی بڑی تعداد نے دو کا پہاڑہ یاد کیا ہوا ہے۔ وہ شروع سے آخر تک یہ پہاڑہ دوہراتے رہتے ہیں، چنانچہ آپ ان کی نظم کہیں سے بھی شروع کر کے کہیں بھی ختم کر سکتے ہیں۔ جبکہ شبنم کی نظم کو ایڈٹ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظمیں ناپ تول کی پوری ہیں سو آپ انہیں کسی بھی شعری پیمانے پر رکھ سکتے ہیں۔ میر تقی میر نے کہا تھا

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

شبنم کو بھی اس کی حساس طبیعت شعری اظہار کی طرف لے کر آئی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا تعلق شاعروں کے اس قبیلے سے نہیں بنتا جو ساری عمر عروض کے کھونٹے سے بندھے لگے پٹے خیالات کی جگالی کرتے رہتے ہیں چنانچہ اس کی نثری نظمیں ہر اس انسانی احساس کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جو حساس ذہنوں میں پنپتے ہیں۔ یوں میرے نزدیک شبنم کی نظم بلکہ 'تم' ایک جدید شہر آشوب ہے اور ہم سب اس کے کردار ہیں۔ شبنم کے سابقہ دو مجموعوں اور زیر نظر مجموعہ "من میں

جمی برف“ کے بین السطور میں ہر طرف دکھ ہی دکھ نظر آتے ہیں۔ یہ دکھ اس کے اپنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ دکھ بھی جو ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک عورت اگر شام ہوتے ہی گھر نہ آئے تو اس کی 'نسوانیت' پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے اور اگر مرد شام ہوتے ہی گھر آجائے تو اس کی 'مردانگی' پر شبہ کیا جانے لگتا ہے۔ شبنم کی شاعری میں یقیناً عورت کے سبھی دکھ موجود ہیں لیکن میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ کلکتہ میں موجودگی کے دوران جب اس کے والد نے سرینگر سے یہ اطلاع دی کہ بزرگ خانساماں جس کی ساری عمر تجرد میں گذری فوت ہو گیا ہے تو وہ گھنٹوں پھوٹ پھوٹ کر کیوں روتی رہی، مرنے والا تو مرد تھا اور اللہ جانے اس کے زیر نظر مجموعہ میں ساری عمر حسرت کے سبب تجرد کی زندگی بسر کرنے والے اس ملازم کا دکھ اس کی کون سی نظم میں اور کس صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دراصل دکھوں پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ یہ آدم و حوا کا مشترکہ ورثہ ہیں، ہم سب کسی نہ کسی صورت میں دکھوں کے پالنے میں پل کر جوان ہوتے، بوڑھے ہوتے اور پھر قبر تک جا پہنچتے ہیں۔ عورت پر یہ کیفیتیں مختلف صورتوں میں نازل ہوتی ہیں۔ ہماری مشرقی عورت محبت سے محروم نہیں لیکن اسے ملنے والی محبت ان پالتو جانوروں سے مختلف نہیں جنہیں چوما چاٹا بھی جاتا ہے لیکن انہیں لوہے کی زنجیر سے باندھا گیا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک شبنم کی شاعری بنیادی طور پر ہجر کی شاعری ہے، وہ یہ مضمون سو رنگ سے باندھتی ہے اور ہر مرتبہ غم کی ایک شدید لہر پڑھنے والوں میں منتقل کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کا ادھورا پن کانٹے بھرے رستوں پر چلتے چلتے مزید آبلہ پائی کا شکار ہوتا ہے اور اس کی کسک صرف اُس تک محدود نہیں رہتی۔

میری شدید خواہش تھی میں اس مختصر سے اظہاریہ میں طبیعاتی مابعد الطبیعاتی وجودیت، بے معنویت اور اس نوع کے دیگر نظریات کے حوالے سے شبنم کی شاعری کو پرکھتا، لیکن بدقسمتی سے میں کم پڑھا لکھا شخص ہوں، چنانچہ ان مشکل اصطلاحات سے واقف نہیں ہوں سو آپ اس تحریر کے مطالعہ کے دوران یہ اصطلاحات 'حسب ذائقہ' اپنے طور پر استعمال کر سکتے ہیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اور اب آخر میں شبنم عشائی کی ایک مختصر سی نثری نظم:

میری لُکنت اس قلم کی زبان ہے
جسے تمہاری انا نے تراشا
اور یہ جو گونج ہے
میرے وجود کے ٹوٹنے کی آواز ہے
کوئی FEMINISM نہیں
بس
بے حیثیتی ہے!

۔ عطاء الحق قاسمی
(روزنِ دیوار سے)

مکتوب بنامِ عشائی

شبنم عشائی کی شاعری پر ایک طویل اور مسلسل جاری مکالمے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ ایک ساتھ کئی جہتیں رکھتا ہے۔ کبھی وہ اپنے سے باتیں کرتی ہیں، کبھی اپنی دنیا سے اور کبھی بھیدوں بھری طاقت سے جو ہمارے وجود پر حاوی ہے، اور جس کے معلوم اور نامعلوم اشارے پر ہم سب اپنی اپنی ہستی کا بوجھ اٹھائے، بظاہر اپنی راہ چلتے رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہمیں کہاں جانا ہے، اور کب تک یونہی چلتے رہنا ہے۔

شبنم عشائی کو میں نے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک طالبہ کے روپ میں دیکھا۔ اُس زمانے میں میری وابستگی شعبہ اردو سے تھی۔ میرے مرحوم دوست اور شبنم کے استاد وحید اختر شعبۂ فلسفہ سے متعلق تھے۔ اور شبنم اسی شعبے میں پی ایچ ڈی کیلئے اپنی Thesis لکھ رہی تھیں۔ ان کا موضوع وجودی فکر تھی 'وجودیت'، جسے بعض اعتبارات سے بیسویں صدی کی مجموعی ادبی اور تہذیبی و معاشرتی فکر کا شناس نامہ کہنا چاہئے۔ شبنم عشائی کی شاعری میں ایک واضح فلسفیانہ اور جذباتی سطح اسی فلسفیانہ روایت سے شغف کی دین ہے۔ اور اسی وجہ سے شبنم کی شاعری میں خود کلامی اور خود نوشت سوانح کی عناصر کی نمایاں موجودگی کے باوجود بیسویں صدی کی تمام انسانی صورت حال، بالخصوص اس معاشرے میں عورت کی حیثیت اور حسیت کے آثار بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ سلویا پلاتھ اور این سیکسٹن سے ایک شعوری یا غیر شعوری مناسبت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں مشرقی عورت اور مشرقی ماحول کی پیدا کردہ نسوانی فکر کی اُس روایت کے رنگ بھی صاف جھلکتے ہیں جس کی تشکیل اردو میں زاہدہ خاتون شیروانیہ (زخ ش) سے لیکر کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے ہاتھوں ہوئی۔ شبنم عشائی کے یہاں اردو کی جس شاعرہ کا عکس سب سے زیادہ غالب ہے وہ سارا شگفتہ تھیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ شبنم نے اپنے تخلیقی ملال اور افسردگی کو کہیں بے

قابو ہونے نہیں دیا۔ایک سوچے ضبط کا احساس انکے بیان اور اظہار کا نمایاں وصف ہے۔شاید اسی لئے ان کی شاعری ہمارے عہد کی تانیثیت کے حاوی عنصر یعنی برہمی، جلال اور اشتعال کی فضا عاری ہے۔ایک اور دلچسپ پہلو جو مجھے شبنم کی شاعری میں دکھائی دیا۔اس کا بیانی انداز ہے۔ہم ان نظموں کو ایک قصے یا ناول کے طور پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ بات کم اہم نہیں ہے کہ شبنم کی شاعری نے اَن گنت آوازوں کے ہجوم میں اپنی پہچان قائم کرلی ہے۔اور ان کی نظموں کے واسطے سے ہم ان کے اپنے جذباتی، تفکر آمیز اور انتہائی حساس وجود سے متعارف ہوتے ہیں۔ان سے شخصی اور غیر رسمی تعارف نے مجھے ایک خوشگوار تاثر سے دوچار کیا ہے۔اس عہد کے سنجیدہ تخلیقی معاشرے میں شبنم کی شمولیت کو میں ایک وقیع تجربے سے تعبیر کرتا ہوں۔

— شمیم حنفی

شبنم عشائی کی نظمیں

شبنم عشائی کی نظمیں جو مختلف شعری مجموعوں میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں ان سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظمیں اکتسابی نہیں بلکہ کشفی طور پر وجود پذیر ہو چکی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظم نگاری ان کے وجود کے ساتھ ہی خلق ہوئی ہے۔ اس لئے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ جان بوجھ کر لکھی گئی ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب سریر خامہ نوائے سروش ہیں

اگر یہ صورتحال ہے تو ان کی نظموں میں بعض توضیحی اجزا کے ساتھ ان کی زندگی کے حقیقی واقعات، سماجی رشتے، تمدنی عناصر اور خود انکے دانشورانہ ذہن کے عمل کے ساتھ شخصی جذبات وکوائف کا کیا جواز ہے؟ ۔ میرا یہ خیال ہے کہ جس برجستگی (Spontanity) کے ساتھ ان کی نظمیں وجود آرا ہو جاتی ہیں ۔ اس سے ان نظموں کی تخلیقی عمل کو کوئی زک نہیں پہنچتا بلکہ رنگارنگی نیرنگی جمالیاتی اور نشاطیہ آہنگ کی تخلیق ہوتی ہے۔

۔ حامدی کاشمیری (جہات) سرینگر

ملال کی شاعرہ

شبنم عشائی ملال کی شاعرہ ہیں، ان کا ملال محبت آمیز جذبوں کے رائیگاں جانے اور اپنی ذات کے کسی کے ہاتھوں مٹ میلا ہو جانے سے پیدا ہوا ہے۔ اس ملال میں بکھر کے سمٹ جانے، بجھ کر جل اٹھنے اور ڈوب کر ابھر آنے والی رجائیت بھی شامل ہے شبنم خود سپردگی کی دلدادہ ہیں مگر ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو ہم آغوش کیفیتوں سے الگ کر لینے پر بھی قادر ہیں۔ ان کے اندر کی نسائی نرمی اور رفاقتوں کی آنچ سے پگھل جانے کی وارفتگی، جذبے اور کیفیت کی سطح پر انہیں کمزور نہیں کرتی۔ انہیں اپنی ذات کے تموج سے بھی بڑا لگاؤ ہے۔ ہندوستانی عورت چاہے لوگ گیتوں میں ہو یا شاعری میں برہا یا ہجر زدہ ساعتوں کی قیدی کہی جاتی ہے۔ شبنم کی شاعری برہا کی اس عمومی کیفیت اور تصور سے بڑی مختلف ہے۔ یہ شاعری ایک ایسی لڑکی کے عشق آمیز جذبوں کا والہانہ اظہار ہے جو ٹوٹ کر پیار کرنے کے ساتھ ساتھ ٹوٹ کر چاہے جانے کی آرزومند ہے۔ عشق میں ناکامی اسے راتوں کو جاگ کر تکیے بھگونے پر کچھ دیر کیلئے تو اکساتی ہے مگر تھوڑے توقف کے بعد آنکھوں میں خوابوں کی فصل پھر لہلہانے لگتی ہے۔ یہ لڑکی پریشاں نظری کی قائل نہیں اپنے عشق اور اس کی شدت کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ بالکل اس پانی کی طرح جو کنکر یا پتھر کی چوٹ سے تھوڑی دیر کے لئے چیخ اٹھتا ہے اور پھر ساکت ہو کے اپنی گہرائیوں سے ہم کلام ہونے لگتا ہے۔ شبنم کی شاعری اپنے وجود کی نفی بھی کرتی ہے اور اثبات بھی وہ کبھی اپنے روز و شب کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا لیتی ہے اور کبھی اس سوالیہ نشان کو خود ہی اپنی جلتی، سلگتی انگلیوں سے مٹا دیتی ہے۔ کچھ دیر سوچتی ہے اور پھر جیسے اپنے سوال کا جواب پا لیتی ہے۔ شبنم کی شاعری ملال اور ہجر کی سیاہ راتوں میں ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان میں پورے روشن چاند کی رفاقتوں کو پالینے کی شاعری ہے۔ اسی لئے شبنم کے لہجے میں اس ہندوستانی لڑکی کے جذبوں کی پوری شدت اور سچائی ہے جو زندگی میں

امکان بھر عشق کر کے خود پر بے شمار جذبوں اور کیفیات کو منکشف کر لینا چاہتی ہے۔ شبنم عشائی نے "اکیلی" سے اپنے شاعرانہ سفر کی ابتداء کی ہے۔ جو بے حد امید افزا ہے مگر اس امید کی کنجی تو خود شبنم عشائی کی انگلیوں میں جھول رہی ہے۔

زبیر رضوی (ذہن جدید) دلی

آنے والے موسم کی نئی آواز

ڈاکٹر شبنم عشائی اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ براہ راست مخاطب ہو کر اپنے نظریئے پیش کرتی ہیں۔ اپنی شاعری میں 'میں' کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور 'میں' کی وساطت سے نہ صرف اپنی بات کا اظہار کھل کر کرتی ہیں بلکہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں وہ اپنے ذہنی سفر کے دوران ہمیشہ نئے راستوں کی تلاش میں مصروف نظر آتی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز فکر نیا اور جدید ہے، ان کا تجربہ اور مشاہدہ وسیع ہے ان کی ایک اور بھی خوبی ہے وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو بے باکی سے فنکارانہ انداز اور خوبصورت لہجے میں اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں۔ اگرچہ ہر دور اور ہر عہد میں سماج کے دکھ سکھ کی روشنی میں موضوعات بدلتے رہتے ہیں لیکن موضوعات قائم و دائم رہتے ہیں، جن کی بنیاد سچائی پر رکھی گئی ہو اور یہ سچائی ڈاکٹر شبنم عشائی کی شاعری میں موجود ہے، وہ شاعری کبھی نہیں مرتی جس میں آفاقی پہلو ہو اور پڑھنے والوں کے لئے ذہنی اور جذباتی آسوگی کا مواد فراہم ہو۔ ڈاکٹر شبنم عشائی کی نظمیں پڑھ کر ایک ایسی لطیف کیفیت کا احساس ہوتا ہے جو بے نام ہے، ان کی شاعری میں ایک نئے انداز کا اچھوتا پن ہے، روانی ہے، غنائیت بھی ہے اور مٹھاس بھی، "فکر بلندی کی اَن دیکھی قوت ہے" قد آور چناروں کی تازگی ہے، شوخ رنگ پھولوں کی مہک ہے، جھیلوں کی سی خاموشی ہے اور اسی خاموشی میں داخلی اور جذباتی زندگی کے اَن گنت خواب پوشیدہ ہیں۔

......یہ آپ کے خواب ہیں، میرے خواب ہیں، ہم سب کے خواب ہیں......

اور مجھے خواب دیکھنے کی اجازت نہیں ہے......!!

نورشاہ (شاعر) ممبئی

شبنم عشائی۔۔۔

اردو شعروادب کی دنیا میں شاعروں کے ساتھ ساتھ شاعرات کا بھی ہمیشہ بول بالا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی اس کی لے مدہم ہو جاتی ہے اور کبھی تیز رو۔ برصغیر میں اگر اردو شاعری کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو پاکستانی شاعرات اگلی قطار میں نظر آتی ہیں۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے یہاں اردو شاعرات کا اکال ہے۔اردو شاعرات مشاعروں میں عموماً اور وقتاً فوقتاً اپنے مجموعہ ہائے کلام کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس کراتی رہی ہیں۔یہ صاحب کتاب شاعرات ہیں، جو مشاعروں کے سٹیج پر تو شاذ ہی نظر آتی ہیں، لیکن اظہار بیان کی ندرت، الفاظ کے برجستہ استعمال، پیش کش کے انفرادی اور غیر محسوس طریقے اور دل میں اتر جانے والا اسلوب، ان کی شاعری کو دوام عطا کرتا ہے۔'من بانی' کی شاعرہ شبنم عشائی ایک ایسی ہی شاعرہ ہیں جو ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید، مسعودہ حیات، عفت موہانی اور زاہدہ زیدی کی قبیل کی شاعرات میں شمار کی جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں زندگی کی سچائیوں کے ساتھ ساتھ جوانی کے آغاز کے کچے پن کے احساسات کو نہ صرف برتا ہے بلکہ تجرباتی اور مشاہداتی طور پر اس کو خوبصورت الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر پیش بھی کیا۔شبنم عشائی مشہور کشمیری شاعر، غنی کشمیری کے خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔گویا شاعری انہیں وراثت میں ملی ہے۔

بقول محمود ہاشمی ان کی نظموں میں شخصیت کی داخلی عریانی بھی ہے، اور وہ ستر پوشی بھی، جو جسم اور روح کے اسرار کی پنہائیوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ایک نظم دیکھئے:

رفاقت یہ نہیں/ کہ رت جگے مجھے دے کے/ تم اپنے خواب/ دلہن کی طرح سجاتے رہو/ اپنے لان میں/ خوشبو کے گل بوٹے بوتے رہو/ اور مجھے/ دیوانگی دیتے رہو/ یہ کیسی ہم نشینی ہے/ حسین شامیں/ تم اپنی نگاہوں میں اتارتے رہو/ اور مجھے/ جلتی ہوئی یادیں بھیجتے رہو/ تم مجھے/ اپنا ہم نشیں

کیوں کہتے ہو؟

اس نظم میں شبنم عشائی نے عورت کا وہ داخلی کرب پیش کیا ہے، جو ازل سے اس کا مقسوم ہے۔ زندگی کی تمام خوبصورت اور بیش بہا ساعتیں قربان کرنے کے بعد بھی اس کا مقسوم بدلا نہیں ہے۔

ان کا یہ انداز یقیناً کسی لاابالی قسم کی لڑکی کا نہیں ہوسکتا:

ساری راتیں/ بے خوابی میں گذر گئیں/ سارے دن/ بے چینی میں گذر گئے/ بچا کچھ بھی نہیں /سوائے اس ریت کے/ جو میں نے اپنی/ دونوں مٹھیوں میں بھر لی تھی/ تمہاری بے توجہی نے/ میرے/ اَن چاہے وجود کو/ جس انجام سڑک پہ پھینکا تھا/ وہ اب/ میری منزل ہے/ یہ تم مجھے ساتھ لیکر/ کس نئے سفر کی تیاری میں لگے ہو......

راتوں کی بے خوابی، دنوں کی بے چینی، اور مٹھیوں میں بھرا ہوا ریت، اور بے توجہی کے سبب، اَن چاہے وجود کا سڑک پہ پھینکا جانا، منزل سے آگے نئے سفر کی تیاری میں لگ جانا، یہ وہ استعاراتی اور وجود کی تمکنت کی روشنی کو نہارتی ہوئی زبان ہے جو شبنم عشائی کو اپنی ہم عصر شاعرات میں ممیز و ممتاز کرتی ہے۔

۔ منور حسن کمال (عالمی سہارا) دلی

وجودی فکر کا شعری اظہار (من بانی)

تخلیقی ادب کی روایت میں ایسے فن کار بہت کم ہیں جو کسی ادبی تہذیب سے الگ تھلگ ہوتے ہوئے بھی اپنے اظہار کی مختلف کائنات تخلیق کرتے ہیں۔ ایسی شخصیات میں ایک نام کافکا کا ہے جس نے لسانی اور ادبی تصورات سے ماوراء ہو کر ایسے افسانے تخلیق کئے، جن کا رشتہ صرف فن کار کی ذات سے تھا۔ کافکا کے علاوہ ایملی برونٹی کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جس نے انگلستان کے ایک دور افتادہ دیہی ماحول میں اور ادبی معاشرت سے الگ تھلگ رہتے ہوئے وودرنگ ہائٹس (عشق بلاخیز) جیسا ناول تخلیق کیا اور پوری دنیا کے ادب میں ایک انفرادی مثال قائم کردی۔ ادب کی ان انفرادی شخصیات کے تناظر میں ہم شبنم عشائی کو بھی شامل کرسکتے ہیں جو کشمیر کے مشہور شاعر غنی کشمیری کے خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں اور اردو میں نظمیں لکھتی ہیں۔

کشمیر کا ماحول ہندوستان کے باقی لینڈ اسکیپ سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے فلک بوس پہاڑ اور برفانی منظروں میں ڈوبی ہوئی فضا، انفرادی شخصیت کو معاشرتی سرگرمیوں سے کسی قدر محدود رکھتی ہے۔ یہاں ریشئیت اور صوفیوں کی ایک ایسی تہذیب موجود ہے جس نے انسانی فکر کی انفرادی پرتیں تلاش کی ہیں۔ کشمیر کی ادبی روایت میں للا عارفہ کا نام بھی ہے اور شیخ نورالدین کا بھی۔ یہ روایت بھی موجود ہے کہ للا عارفہ عریانی کے عالم میں وادیوں میں گھومتی رہی لیکن اس نے اپنی عریانی کیلئے ان نگاہوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا جو انسانی شخصیت کو صحیح طور پر شناخت نہیں کرسکتیں۔ شبنم عشائی کی نظمیں پڑھتے ہوئے مجھے اکثر و بیشتر للا عارفہ کی روایت اپنے آپ کو دہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان نظموں میں شخصیت کی داخلی عریانی بھی ہے اور وہ ستر پوشی بھی جو جسم اور روح کے اسرار کو پنہائیوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ کشمیری ادب کی روایت اور وجود کا احساس، یہ دو بنیادی استعارے ہیں جن کے اشتراک نے شبنم عشائی کی نظموں کو بے حد مختلف اور اہم بنادیا ہے۔

اس تناظر کا ایک اور پہلو بھی ہے ۔ شبنم عشائی Existentialism (وجودیت) کی اسکالر ہیں ۔ بیسویں صدی کا یہ فلسفہ، ہمارے عہد اور جدید دنیا کی انسانی سوچ پر اتنا محیط ہے کہ کسی دوسرے نظریے کی چھاپ اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی ۔ سبب یہ ہے کہ انسان اور آسمانوں سے اس کا رشتہ ختم سا ہو گیا ہے ۔ خدا کا وجود فکر کے کہروں میں لپٹا ہوا موجود تو ہے لیکن اس کی تائید اور تسخیر کرنے والے ذہن ناپید ہیں ۔ وجود روح پر حاوی ہو چکا ہے ۔ Existence before essence

شبنم عشائی کی تخلیقی شخصیت میں اس وجودی فکر کا بڑا عمل دخل ہے ۔ ان کا وجود ان کی خودی ہے اور خودی ایک آئینہ ہے یا جام جمشید ہے جس میں شبنم عشائی کے تخلیقی ذہن کی کائنات، زندگی اور شخصیت کے تمام اسرار نمایاں نظر آتے ہیں ۔ ان عناصر میں ایک اضطراب ہے، ایک Tension ہے، ایک تصادم ہے جو شبنم کی نظموں کو ایک چکرویو کی طرح اپنے محور پر گھماتا رہتا ہے ۔ الگ تھلگ عکس نظر آتے ہیں اور پھر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں ۔ اس اندازِ فکر کی تھوڑی سی وضاحت کیلئے شبنم کی ایک مختصر نظم کا حوالہ دینے کی خواہش ہے:

وجود کے جو حصے
وجود کی تلاش میں کھو جاتے ہیں
ان کا اندراج
زندگی کی کسی بھی File میں نہیں ملتا
ہاں ان نظموں میں جو آنسوؤں کی روشنائی سے
لکھی گئی ہوں
وہ حصے بستے ہیں
لیکن پھر ہمیں تاریکی کو
اپنا نشیمن بنانا پڑتا ہے
اس راز سے زندگی نہیں
وجود واقف ہے
اور ہم
وجود نہیں

زندگی جیتے ہیں!

اس نظم میں شبنم نے یہ واضح کیا ہے کہ زندگی کی افہام وتفہیم سے زیادہ وجود کا ناگزیر ہونا اور اس کا اعتراف کرنا زیادہ ضروری ہے کہ زندگی کے عرفان کیلئے یہی ایک وجودی طریقۂ کار ہے۔

شبنم کی نظموں میں موت کی سی خاموشی ہے۔لیکن خاموشی میں داخلی طوفانوں کا ایک اژدھام موجود ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبنم کی ہر نظم ایسی قبروں کا نوحہ ہے جن پر کتبے نہیں ہیں۔نامعلوم اموات کے انبوہ میں زندگی کی کرچیں کچھ اس طرح چمکتی رہتی ہیں جیسے یہ نظمیں احساس کے المیوں کی بڑی منفرد داستان ہیں اور ان داستانوں میں شاعر کی شخصیت کے علاوہ ہمارے عہد کی داخلی سوچ کے شعلے اپنے خاکستر سے چمکتے رہتے ہیں اور منصوبہ بند زندگی کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔یہ نظم پڑھئے:

جب ہم کسی خیال کو
زندگی دینے سے رہ جاتے ہیں
تو وہ دفن ہو کر
من میں قبر بنا لیتا ہے!
ایسی قبریں
بنا کتبے کے ہوتی ہیں
اور چرواہے اکثر
مویشیوں کو
ایسے قبرستانوں میں
چراتے ہیں
قبریں اندھی ہوتی ہیں
خیال اندھے نہیں ہوتے
وہ قبر سے بھی
جھانکتے رہتے ہیں
گزرتے ہوئے ہر پیر کی
آہٹ کا مزہ لیتے ہیں

اور ہمیں

فرار دیتے ہیں!

شبنم کے پہلے مجموعہ سے اب تک کی نظموں میں ایک ارتقائی تخلیقی سفر کا بھی استعارہ موجود ہے۔ ابتدائی عہد کی نظموں میں شبنم کی بیشتر شاعری خود کلامی کا طرز اختیار کئے ہوئے تھی، اس کے بعد سایوں کے طور پر کسی دوسری شخصیت کے احساس میں مدغم ہو جانے کی کیفیت بھی موجود ہے۔ یہ شنویت کی منزل ہے جہاں وجود کو اپنے مقابل کوئی دوسرا وجود متصادم نظر آتا ہے۔ اس منزل پر شبنم عشائی کی نظمیں زندگی کی پہلی کنواری ہمرشتگی کا منظر نامہ بن جاتی ہیں۔ ایک نظم اس کی وضاحت کیلئے بہت کافی ہے:

لاؤ ذرا پہن لوں تمہیں

تنہائی اتار دی میں نے

باہر کاریڈور میں پڑی سسک رہی ہے

اپنے دھیمے لہجے میں

وہ ساری داستانیں سناتی

جنہیں سن کر میں دھیمی آنچ پر پہروں سلگتی تھی......

لاؤ ذرا پہن لوں تمہیں

وہ key hole سے جھانک رہی ہے

جیسے ہم موقعہ پاتے ہی

اپنے اصل میں جھانکتے ہیں

اس سے پہلے کہ وہ

مجھے ننگا دیکھ پائے

لاؤ ایک دوسرے کی اصل میں

شامل ہو جائیں

میں اپنی ساری شبنم

تمہاری پلکوں پہ گراتی ہوں

تم میری سانسوں کی پگڈنڈی سے
میرے اندر اتر آؤ
میں ڈھک جاؤں گی
اپنی اصل کی اماں پاؤں گی
لاؤ ذرا پہن لوں تمہیں

وجودی فکر سے وابستگی کا ایک اور پہلو شبنم کی شاعری میں بدھ کے فلسفہ سے قریب آجاتا ہے۔ یہ منزل نروان کے حصول اور نروان کے سفر کی ہے۔ پامالیوں سے مسلسل دست و گریبان رہنے کے بعد سوچ کی منزلیں کس طرح نکھرتی ہیں اور کس طرح وجود کی تمکنت پر روشنی کے قطرے ابھر کر آتے ہیں۔اس کی کیفیت شبنم عشائی کی بہت سی نظموں میں موجود ہے۔ایک مختصر نظم اس کی وضاحت کر سکتی ہیں۔

تم نے مجھے اتنی بار مٹا دیا ہے
کہ اب میں
بنا کسی چہرے کے
جی سکتی ہوں
لیکن کوئی مجسمہ نہیں بن سکتی!
اگر ایک بار بھی
تم مجھے
پڑنے کے بعد مٹاتے
میں دکھ تراشنے کی مشق
نہیں دہراتی
تم دوسروں کو
دکھ دینے کی سرشاری میں جی سکتے ہو
میں بہت سارے دکھ تراش کر
کوئی مجسمہ بنا سکتی ہوں

ایک بار
ایک دکھ کی دکھن
تم بھی لے لو
مجھے کسی
دکھ کا چہرہ بناتے ہوئے
لکھ لو

شبنم کی شاعری پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ شاعری کا مقصد کیا ہے لیکن ہزاروں برس سے انسان شعری پیرائے میں اپنے اظہار کو پیش کرتا رہا ہے۔ تہذیب کے پہلے سورج سے آج تک شعر کے سلسلے میں بہت سے سوالات بھی قائم کئے جاتے رہے ہیں۔ ادبی فکر کے بہت سے ایسے مکاتب بھی وجود میں آچکے ہیں جو تخلیق فن کے ضابطے قاعدے قوانین مقرر کرتے ہیں۔ میں تنقیدی جارگنوں سے شعر کو پڑھنے یا اسکے وجود کو پہچاننے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے یہ علم ہے کہ الوہی اظہار کے تمام تر پیمانے ایک ردم، سنگیت اور ناگفتہ منطق کے حامل ہوتے ہیں۔ نغمات داؤدی پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ تصور بھی قائم نہیں ہوتا کہ یہ پیمبرانہ پیغام ہے۔ الوہی اظہار کی اسی کیفیت کی وجہ سے مقدس صحیفوں کے سلسلے میں شاعر پر اظہار کا الزام عائد ہوتا رہا ہے۔ تاہم شاعری بہر حال ایک الگ انفرادی اظہار ہے اور یہ تخلیق کے تناور درخت پر کھلتے ہوئے پھولوں کا سا ذائقہ اور ردم پیش کرتا ہے۔ شبنم کی نظموں میں یہ ردم اور خود کار فکر کے غنچے اس لئے بھی زیادہ انوکھے محسوس ہوتے ہیں کہ ان میں وادی کشمیر کی سی انفرادیت اور پاکیزگی ہے۔ شبنم کی نظمیں ایک سطح پر اردو میں ایک انتہائی الگ طرز کا مرقع ہیں۔ ان میں سراسیمگی بھی ہے۔ تجسس بھی اور پیکار بھی...... یہ شاعری صرف ایک عورت کی شاعری نہیں ہے۔ ایک ایسے وجود کی شاعری ہے جس نے اپنے عہد میں زندگی کے نشیب وفراز کو بھوگا ہے۔ شبنم کا وجودی اظہار تانیثیت کے اس ادب کا واضح ثبوت ہے جس میں عورت کی خودی، اس کا اظہار اور اس کی بغاوت، مرد کی شاعری سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اب تک اردو شاعری میں جو خواتین شعراء سامنے آتی رہی ہیں، ان میں یہ خصوصیات کم کم موجود ہیں۔ شبنم نے اپنے پورے شعری اختیار کو ایک مخلوط اور نامیاتی کل کا پیکر بنایا ہے۔ یہ نظمیں رنج وغم، درد وفراق، احساس شکست واضطراب اور بعض گم شدہ مسرتوں کے ایسے

پھولوں سے گوندھی گئی ہیں جو ایک شعری گلدستے کی حیثیت سے ہمارے عہد کی شاعری اور نظم کی شاعری کو ایک نیا وقار عطا کر رہی ہیں۔

شبنم عشائی کی تخلیق اور سوچ میں بے حد عمیق درک موجود ہے لیکن شعری اظہار ان سے یہ بھی تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر میں جولانی اور سست روی کے پیرایوں سے بھی واقف ہوں۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہو کہ شاعری میں "میں"، "تم"، "وہ" کے تخاطب میں اظہار کی انفرادی اور مکمل شخصیت کو بکھرنے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔

اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہنوز شبنم کی شاعری میں "میں" کا وجود انہدام یا انتشار کی منزلوں تک نہیں پہنچا۔ وہ ابھی فن کے اور اظہار کے بے پناہ تقاضوں سے نبرد آزما ہو سکتی ہیں۔ زندگی اور سوچ انہیں دعوت و فکر دے رہی ہے۔ ان کی نظمیں خود ان سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ اپنے وجود کی کائنات میں ابھی بہت سے بڑے اظہارات کو پناہ دے سکتی ہیں اور ان کی شاعری اردو میں ایک منفرد طرز اور شخصیت کا پیمانہ اور محور بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ عرفان حاصل کر لیا ہے کہ اظہار کی شخصیت کو ٹیلکم، پاوڈر سے نفیس بنانے کے بجائے نمک چھڑک کر اسے سلگتا ہوا بے چین اور مضطرب رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی ان کی تخلیقی منزل ہے اور یہی ان کی انفرادیت کے سفر کی پہلی منزل ثابت ہو سکتی ہے:

میں جسم پہ Talcum نہیں
اپنے وجود پہ
نمک چھڑکنا چاہتی ہوں
صدیوں سے جمی ہوئی
برف کاٹنا چاہتی ہوں
کیا تم رشتوں کا الاؤ
دہکا سکتے ہو؟
میں اپنی آنکھوں کو
آنسوؤں سے
طلاق دلانا چاہتی ہوں

جو صدیوں سے
آنسو کاشت کر رہی ہیں
کیا تم میری آنکھوں کو
خواب دے سکتے ہو؟
زمانے کے بکھیڑوں میں نہیں
من کی دنیا میں
گھر بنانا چاہتی ہوں
بس اب میں
دل کی بات سننا چاہتی ہوں
کیا تم میرے من میں
بول سکتے ہو؟

_ محمود ہاشمی (دلی)

ہم بھی ہیں۔۔۔

شاعری اپنی خفی و جلی آوازوں کی سطحوں کو بھی مرتب اور غیر شکل میں نمو ریز کرنے کا ہنر درشاتی ہے۔
کبھی کبھی ان آوازوں میں شاعر کی آواز پہچان لی جاتی ہے یا یہی آوازیں شاعر کی آواز کو دبا دیتی ہیں یا اسے کوئی اپنی نجی پہچان بنانے سے روک دیتی ہیں۔ یہی وہ شعری سفر کی منزلیں ہیں جہاں شاعر کا باطنی یا خارجی سفر شروع ہوتا ہے۔ شاعر کی افتادِ طبع ان آوازوں میں کسی ایک میں اپنا رنگ بھرتی ہے یا ان آوازوں کی ہی مطیع ہو کر اپنی ہی پہچان کھو بیٹھتی ہے۔ ایسی ہی جانی یا پہچانی آوازیں اپنے ہونے کا احساس ضرور دلا دیتی ہیں مگر وہ سنجیدہ یا ذہین قاری کو اپنی گرفت میں لینے کے لائق نہیں ہوتیں۔ اور نہ وہ انہیں ملتفت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی لئے اس قبیل کی آوازیں روز بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ اپنی بے ہنگم بے ترتیب آہنگ سے "ہم بھی ہیں" ہونے کا اعتراف چاہتی ہیں۔ اور جب کبھی کوئی شاعر نثری ٹکڑوں میں موسیقانہ ارتعاش پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہی نثری ٹکڑے مرتب آہنگ سے پیکر تراش لیتے ہیں۔ یہ خوبی انہیں دستِ ہنر کا حصہ ہیں جنہیں الفاظ کی وابستگی کا علم حاصل ہے۔ شبنم عشائی نے اپنے اس مغنیہ نثری آہنگ سے شعریت کا چراغ روشن کیا۔ ان میں وہ غزلیہ آہنگ کی بوباس تو نہیں اور نہ مغنیہ کی انگلیوں کا زیر و بم۔ ہاں ان نثری ٹکڑوں کے زیریں محرکانہ سوچ کسی ویرانے کے احساس کی سرکتی آواز کا پرتو ضرور ہے یا دور کسی ویرانے میں چلتے دیوانے کے قدموں کی چاپ سے لپٹتی سمٹتی آواز۔ یہی زیریں لہر اس فکر کو لفظ کی بالائی سطح پر لا کر نرم، ملائم آوازوں کا طلسم جگا دیتی ہے اور آوازں سے پیوستہ فکر کا منظر نامہ تیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اس منظر نامہ کی تیاری میں فکری عوامل کا رول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
شبنم عشائی کے دھڑکتے دلوں سے ہم آہنگ ہوتی سوچ تصویریت کے عمل سے خود کو گزار لینے میں کامیاب ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری میں تصویر سازی کے عمدہ نمونے مجسم ہو گئے ہیں۔ اس کی شاعری خوبصورت آرٹ گیلری کا منظر پیش کرتی ہے۔ آئیے آپ بھی دیکھیں ان تصویروں سے پھوٹتی شعاع کچھ کہہ بھی پا رہی ہیں یا نہیں۔

☆ تمہارے احاطے کے باہر کا پیڑ تھی

☆ تکیہ سے خواب اڑا لے گئی

☆ تنہائی تم سے مخاطب ہے

☆ اک بے خوابی کا صحرا ہے

☆ آسودہ نیند سو گئی

☆ نہ ہونے کا کفن اوڑھے

☆ کوئی سارے رنگ چرا کر لے گیا

☆ کالی پرچھائیوں نے راستے گھیر لئے

نسائی رنگوں کی ملامت سپردگی کی آواز' بدن کی قوس قزح' ہجریاتی لمحے کی کسک' وصال کی خوشبو' تھکی تھکی آنکھوں کا انتظار' لمسیائی رنگ' چاہتوں کی شام' بازوؤں کی اوٹ میں جینے کی چاہ' نے ان تصویروں کو اور بھی زیادہ جاذب نظر بنا دیا ہے۔ مگر اس کے پس پردہ کوئی خواہش ادھ کھلے پٹ کے پاس کھڑی اس لڑکی کو کہیں اور آگے کر دیتی ہے۔ اور اس کے خاموش ہونٹوں' آنکھوں' اور دست و پا کی متحرک انگلیوں سے وہ سب کچھ کر جاتی ہے جو ہجریافتہ لڑکی کا شیوہ ہے۔ مثلاً:

میری ہر ٹہنی
تم اپنے ہاتھوں تراشتے
میں سنور جاتی

....

تم اپنی سانسوں میں بسی خوشبو سے دور
اپنی تنہائی کی ایک شام
مجھے دے دو

....

مرے جود میں
اپنی شفاف خشک کرنوں سے
نور پھیلا دو

— ساحل احمد (آج کل) بین الاقوامی ادبی ماہنامہ دلی

تصوف، ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کا حسین امتزاج ڈاکٹر شبنم عشائی

اگر چہ حضرت خواجہ معین الدینؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، گرونانک اور کبیر داس وغیرہ جیسے صوفی سنت شعراء نے عوام وخواص کو انسانیت، محبت، ایثار وقربانی اور وسیع القلبی کا پیغام اپنی شاعری سے دیا لیکن ان کا عہد آج کے دور سے بہت حد تک مختلف تھا۔ ان حضرات کو ماحولیاتی آلودگی، مشینوں کی گڑگڑاہٹ، ٹوٹتے ہوئے معاشری اور خاندانی رشتوں اور اقدار کش حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، تاہم دور حاضر کے صوفی منش شعراء کو ان پیچیدہ حالات کی بھٹی میں تپنا پڑتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر شبنم عشائی جیسی صوفی صفت شاعرہ کے کلام میں حالات کی تپش کا احساس ہوتا ہے اور احساس وافکار کی یہ تپش ہی اس کا اشارہ کرتی ہے کہ شبنم عشائی ایک مابعد جدید صوفی شاعرہ ہیں۔ درحقیقت شبنم کی شاعری میں تصوف، ترقی پسندی اور جدیدیت کے اثرات نمایاں ہیں اور یہی اثرات انہیں مابعد جدید شعرا کی صف میں رکھنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

شبنم عشائی کا 'من بانی' تا 'کتھارسس' تخلیقی سفر اس حقیقت کا غماز ہے کہ وادیٔ کشمیر کی اس حساس شاعرہ کے یہاں جہاں افکار کی ہمالیائی بلندیاں ہیں، وہیں جھیل ڈل اور چناب کی گہرائیاں بھی ہیں۔ کتھارسس ان کا شعری مجموعہ ہے، جس میں زینت اشاعت بن کر ان کی نظمیں قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ شاعرہ کا بلند تصوف دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہ ملاحظہ فرمائیں۔

جانے
کہاں دب گئے ہیں

انسان کی کھوج میں

میرا چہرہ

پتھر ہو گیا ہے

جانوروں کی

بھیانک آوازں میں

میں نے میری آواز کھودی

پتھر چہرہ

بن آواز کا وجود

کتنا بھیانک ہوگا

تمہیں معلوم بھی ہے؟

جو ہے تو دیکھتے کیا ہو

تم تو خدا ہو !

شبنم کی نظموں میں تصوف کے ساتھ ترقی پسندانہ اور جدید احتجاج بھی ہے۔ ان کی یہ نظم دیکھئے:

تم

مجھ میں

اُگ سکتے

کھل سکتے

لہلہا سکتے

جذب ہو سکتے تھے

میں تخلیق کی مٹی ہوں

کیسینوں کی ٹیبل نہیں

کہ تم مجھ پہ داؤ لگاؤ

جیتو

کہ دیوالیہ ہو جاؤ

'کتھارسس' میں شامل شبنم عشائی کی نظمیں بحور، وزن، قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے آزاد ہیں اور الہڑ پہاڑی ندیوں کی طرح فطری انداز میں تصوف کی بلند پہاڑیوں پر بہتی ہیں، تو کبھی ترقی پسندی کی وادیوں سے گذرتی ہوئی جدت کی گہری کھائیوں ل میں پہنچ جاتی ہیں۔ شاعرہ نے ہندوستانی صوفی سنتوں کی طرح اپنی زبان کو عوام سے قریب رکھا ہے اور علمیت کی شان دکھانے کیلئے ثقیل الفاظ وزبان سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ ہندی اور انگریزی کے عام الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر شبنم عشائی کے خانگی حالات سے میں واقف نہیں، لیکن ان کی نظموں سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ مردزدہ معاشرے اور خواتین کے سماجی، ثقافتی و معاشی استحصال اور مردوں کے تکبر سے وہ نالاں ہیں اور شاعرانہ انداز میں وہ ان سب کے خلاف احتجاج بھی کرتی ہیں، لیکن اپنی نسوانیت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی اس نظم پر غور کیجئے۔

میں نے تمہیں
تمہاری زندگی
تمہارا جنون
تمہاری روٹھ
کچھ بھی جینے سے روکا نہیں
تم مجھے
روٹی کھانے سے روک رہے ہو
تم
جھوٹ، دکھاوا، غصہ
کچھ بھی لے کے
جی سکتے ہو
میں صرف سانس
اور روٹی کا ٹکڑا لے کے
جی سکتی ہو

شبنم عشائی کی ابتدائی شاعری للا عارفہ کے افکار سے متاثر رہی لیکن 'کتھارسس' کی نظموں تک آتے آتے انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کرلی ہے۔ اس شعری مجموعے میں شبنم کا تصوف بھی ہے، باغیانہ یعنی ترقی پسندانہ شعور بھی اور جدید لب ولہجہ بھی۔ اس لحاظ سے وہ للا عارفہ، پروین شاکر، ساجدہ زیدی اور زہرہ نگار وغیرہ سے الگ نظر آتی ہے۔

بہرحال شبنم عشائی کا تاریخی اور ادبی مقام تو مستقبل طے کرے گا لیکن بلاشبہ وہ ایک منفرد شاعرہ ہیں۔

— اسد رضا (ماہنامہ بزم سہارا)

شبنم عشائی کی من بانی

ڈاکٹر شبنم عشائی عصری ادب کی ایسی شاعرہ ہیں جو پڑھتی ہیں، سوچتی ہیں اور پھر لکھتی ہیں۔ اردو شاعری میں غالبؔ، اقبالؔ، فراق اور اختر الایمان جیسے بلند پایہ شعراء کو چھوڑ کر عموماً شاعر بیانِ حسن و عشق، پیکر تراشی اور موزونیت کو شاعری سمجھ بیٹھے ہیں اور بندھے ٹکے خیالات کو نت نئے پیراہن پہنانے کو کمال فن سمجھتے ہیں۔ نظم اور پھر آزاد نظم کے ظہور میں آتے ہی یہ روایت ٹوٹتی نظر آنے لگی لیکن فکر کے نگینے جڑنا، پھر بھی چند ایک شعراء تک ہی محدود رہا۔ تانیثی ادب میں پروین شاکر کے یہاں ایسے گہر جا بجا ملتے ہیں اور اسی سلسلے کی کڑی شبنم عشائی بھی ہیں جو فلسفے کی طالب علم ہونے کے سبب فکر و تدبر کے اتھاہ سمندر میں اپنے قلم کو ڈبو کر نظمیں تحریر کرتی ہیں۔ یہ وصف ان کی شاعری کو امتیاز بخشتا ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں انکا ماننا ہے کہ ''شاعری میرے خیال میں اس چیز کو نہیں کہا جا سکتا ہے جو فقط گائی جائے بلکہ میرے نزدیک اس المیے اور صدمے کی بازیافت کا نام ہے جو روز ازل میں ہوا ہے، اور اس صدمے کی تمازت میری شاعری میں پہلو بدل رہی ہے''۔ چند سال پہلے ان کا پہلا شعری مجموعہ 'اکیلی' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا اور اب زیر نظر مجموعہ 'من بانی' ہمارے سامنے ہے۔ 'من بانی' کی نظموں کو شاعرہ نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ 'میں سوچتی ہوں'، 'اکیلی' اور 'من کی نظمیں'

شبنم عشائی نے ۱۲/اپریل ۱۹۶۲ء کو جنت بے نظیر وادی کشمیر کے ایک چھوٹے سے قصبے تاپر پٹن میں ایک جاگیردارانہ گھرانے میں آنکھ کھولی، مگر جوان ہوتے ہی اپنے وجود اور ہستی پر سوالات اٹھائے۔ موصوفہ نے پہلے ایم فل کیلئے 'کامو کے فلسفہ بیگانگی (Camus' Concept of Alienation) پر مقالہ لکھا اور پھر اس کی توسیع کے طور پر پی ایچ ڈی کے لئے 'بیگانگی کا وجودی نظریہ' (Existentialist Concept of Alienation) پر مقاملہ لکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی

ڈگری حاصل کی۔اس وجودی فلسفے کی چھاپ ان کی شاعری پر صاف طور پر نظر آتی ہے۔بقول شاعرہ 'میری شاعری میرے دکھ درد کو پیش کرتی ہے کہ میں اپنے وجود کو معنی دینے کی تلاش میں نظمیں کہہ رہی ہوں'۔

مجھے میری من کی قبر میں ہی/ پڑھ لو/ ناول نہیں/ ایک درد ہوں میں/ جو زندگی سے/ زیادہ پتھریلا ہے/ درد کبھی بھی تمہارے من سے مل سکتا ہے/ بس طوفان کا/ کوئی حلف نہیں اٹھانا/

ڈاکٹر شبنم عشائی خوبصورت بھی ہیں اور خوب سیرت بھی/ تنہائی پسند ہونے کے باوجود وہ ہر ایک سے پُر تپاک انداز میں ملتی ہیں اور زندگی کے مسائل اور فلسفوں پر گفتگو کرتی ہیں۔زندگی کے بارے میں ان کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

چلتے چلتے/ پاؤں چھلنی ہو گئے/ بن منزل کے/ سفر کتنا دشوار ہے/ ہر راہ/ دھوپ برساتی ہوئی / قاتل لگ رہی ہے/ پر/ چلتے رہنا/ ازل کا لکھا ہے/ ذرا رک گئی/ تو تھک جاؤں گی/ دیکھو مجھے/ آواز مت دینا/

جادۂ زندگی پر شبنم عشائی کئی ایسے حادثات سے گذر چکی ہیں جہاں سے لوٹ آنا کسی معجزے سے کم نہیں، پھر بھی وہ ہمت و استقلال کے ساتھ ان مصائب کا مقابلہ کرتی ہوئی نغمے بکھیرتی چلی جا رہی ہیں۔بقول شاعرہ 'میں اپنی تخلیقی قوت کے سہارے اپنی پہچان کو قائم رکھے ہوئے ہوں۔ میری نفسیات کی بنیاد ذوقِ جمال ہے اور خوبصورتی میرے اندرون کی وادیوں میں چھلکتی ہے۔ میں اساطیر میں رہتی ہوں۔میرے بارے میں قسم قسم کی کہانیاں بتائی گئی ہیں۔ان کہانیوں کو میں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔'' صوفیوں، سنتوں اور ریشیوں کی اس دھرتی کے مشہور شاعر غنی کشمیری کے خانوادے سے تعلق رکھنے والی یہ انوکھی شاعرہ تلاشِ حق میں سرگرداں ہے اور ریاکاری و منافقت سے نفرت کرتی ہیں۔انہیں خوشبوؤں خاصکر دھوپ اگربتی سے خاص لگاؤ ہے۔

منافق لوگوں کے درمیان/ میں سچی بات کہتی رہی/ تو مجھے شہر چھوڑنا پڑا/ بھاگتے بھاگتے ہانپ گئی/ اور پیڑ کے نیچے/ بس آنکھیں موند لیں کہ پیڑ نے/ چھاؤں میں رکنے سے منع کیا/ لیکن میری ساری جیبوں کو/ چھاؤں سے بھر دیا/ میں اکثر/ چھاؤں سے بھری جیبوں کو خالی کر کے/ دھوپ کی گرد پونچھ دیتی ہوں/ پیڑ سخی تھا/ پر گروی تھا/ اس خیال سے ایسے بھر جاتی ہوں/ جیسے گرجا گھر/ خاموشی سے۔

محمود ہاشمی کا ماننا ہے کہ ان کے ہاں وجود روح پر حاوی ہو چکا ہے، اور ان کی شاعری بودھ فلسفے کے بالکل قریب آئی ہے۔ وجودیت کی سکالر ہونے کے سبب اس کی شاعری میں خود کلامی شنویت اور وجود کے مقابل کوئی دوسرا وجود متصادم نظر آتا ہے۔ انہی خوبیوں کے باعث ان کی نظمیں اپنا ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں محمود ہاشمی فرماتے ہیں: "شبنم کی نظمیں ایک سطح پر اردو میں ایک انتہائی الگ طرز کا مرقع ہیں۔ ان میں سراسیمگی بھی ہے۔ تجس بھی اور پیکار بھی۔ یہ شاعری صرف ایک عورت کی شاعری نہیں ایک ایسے وجود کی شاعری ہے جس نے اپنے عہد میں زندگی کے نشیب و فراز کو بھوگا ہے۔ شبنم کا وجودی اظہار تانیثیت کے اس ادب کا واضح ثبوت ہے جس میں عورت کی خودی، اس کا اظہار اور اس کی بغاوت مرد کی شاعری سے مختلف ہو جاتی ہے"۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل نظمیں پیش خدمت ہیں۔

تم بار بار/ جینے کی خاطر/ میری من کی مٹی میں/ موت کیوں بوتے ہو؟/ جو مٹی تخلیق کا دکھ/ سہتی ہو/ بانجھ نہیں ہوتی/ تم مجھ سے/ اور کتنی نظمیں لکھواؤ گے؟۔

تم تو میرا دکھ سمجھ بھی نہیں سکتے/ وجودیت پر پی ایچ ڈی کرنے کے بجائے/ میں نے گھاس کو/ پیروں کے نیچے دبتے ہوئے/ کیوں نہیں دیکھا/ یا پھر بکری کو/ ذبح ہوتے ہوئے کیوں نہیں دیکھا؟

چنانچہ شبنم عشائی دور جدید کی پیداوار ہیں اس لئے ان کی شاعری میں تشبیہات اور استعاروں کی فراوانی ملتی ہے۔ انہوں نے روایتی تشبیہات کے علاوہ خود ساختہ تشبیہات کا استعمال بھی کیا ہے جو نہ صرف برمحل ہیں بلکہ دلکش بھی ہیں۔ مثلاً سورج مکھی جیسی گردن۔ ان کے یہاں 'مہک' انفرادیت اور پہچان کا علامیہ ہے، اور پیڑ پودے، دھوپ، برف، چاندنی، دریا، زرد، اور سرخ رنگ زندگی اور رونے کی علامتیں بن کر سامنے آتی ہیں۔

شاعرہ مادہ کے مقابل آواز (ناد) کو مقدم مانتی ہیں۔ بقول شبنم عشائی "'میں' میں ہوں اور 'میں' میری آواز ہے۔ میری آواز الگ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے اور آواز ہی دنیا کی پہلی حقیقت ہے"۔ آگے جا کر شاعرہ یہ بھی دعویٰ کرتی ہیں کہ "میں کوئی نظریہ ساز نہیں ہوں اور نہ ہی نظریوں کی روشنی میں اپنے ہونے کا استدلال پیش کرتی ہوں۔ میں بذات خود ایک آواز ہوں، اور یہ آواز جب زبان کی صورت اختیار کر کے صفحہ قرطاس پر آجاتی ہے تو یہی میری آواز، پیکر بن کر شکلوں کی

صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ ان شکلوں کے معنی مطلب وہی ہوتے ہیں جو کہ صدیوں سے سماجی رشتوں نے ان کو دیئے ہیں۔"

شبنم عشائی کی شاعری ذاتی کرب کی شاعری ہے۔ وہ نہ سماج کے مسئلوں پر منشور لکھتی ہیں اور نہ ہی واہ واہ کی طلب میں گل وبلبل اور شمع پروانے کی باتیں کرتی ہے۔ وہ ایک عورت ہے۔ وہی عورت جو خواب بنتی ہے، جس کے دل میں ایک خوبصورت گھر بنانے کی آرزو ہے، اور جو اپنے محبوب کی محبت میں سرشار ہونا پسند کرتی ہیں تاہم انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ عورت کے یہ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ کہیں بنا بنایا گھر ٹوٹ جاتا ہے، کہیں محبوب ہرجائی ہوجاتا ہے اور کہیں خود اُسے دربدر ہونے کا فرماں جاری کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے چند نظمیں پیش ہیں۔

ایک روز/ میں نے سجدے سے/ سر اٹھایا/ وہ/ وہ تھا ہی نہیں/ جس کو میں پوج رہی تھی۔

....

جب نفرتوں کی بارشوں میں/ گھر/ زمین بوس ہوجاتے ہیں/ تو من/ ہجرت کی چھت میں/ گھر بنا لیتا ہے/ ہجرت کی چھت/ جلاوطن لوگوں کی طرح/ یقین سے محروم ہوتی ہے/ لیکن من اس بات سے/ محروم نہیں ہوتا/ کہ وہ دوبارہ/ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔

....

میں جسم پہ ٹیلکم (Talcum) نہیں/ اپنے وجود پہ/ نمک چھڑکنا چاہتی ہوں/ صدیوں سے جمی ہوئی/ برف کاٹنا چاہتی ہوں/ کیا تم رشتوں کا الاؤ/ دہکا سکتے ہو؟/ میں اپنی آنکھوں کو/ آنسوؤں سے/ طلاق دلانا چاہتی ہوں/ جو صدیوں سے/ آنسو کاشت کر رہی ہیں/ کیا تم میری آنکھوں کو/ خواب دے سکتے ہو؟/ زمانے کے بکھیڑوں میں نہیں/ من کی دنیا میں/ گھر بنانا چاہتی ہوں/ بس اب میں/ دل کی بات سننا چاہتی ہوں/ کیا تم میرے من میں/ بول سکتے ہو/

....

لاحاصلی کی گرد/ ان تصویروں پر جم گئی ہے/ جو ایک دوسرے کے تصور کے سہارے/ کھینچی تھی/ تم نے/ اور میں نے/ تم سوچ رہے ہو کہ میں روٹھ بیٹھی ہوں/ دکھوں کی برف ہٹاتے ہٹاتے/ میری انگلیاں کٹ گئی ہیں/ کیسے جھاڑوں ان تصویروں کو؟/ میرے من سے تم/ ان تصویروں کے نقش/ مٹا کیوں نہیں دیتے/ تمہاری انگلیاں تو سالم ہیں۔

....

انہیں نہیں معلوم/ جب بھروسہ/ یقین، اعتبار/ کھو جاتے ہیں/ تو سفر کتنا دشوار ہوتا ہے/ انہیں یہ بھی نہیں معلوم/ جب خواب/ خیال، خوشی/ چھن جاتے ہیں/ تو پیروں میں/ کیسی بیڑیاں پڑتی ہیں/ جھنڈ میں ہوتی تو/ ان کا ہانکنا مجھے/ دوڑا سکتا تھا/ بھیڑوں سے/ الگ ہو جانے کی سزا/ کتنی یکتا ہے/

....

اپنی لاحاصلی کی/ سیہ کاری میں/ بھیگ جاتی ہوں تو/ جان ٹھٹھرتی ہے/ پھر کپکپاتا وجود/ الاپ کر/ نہ ہونے کا کفن اوڑھے/ کشکول/ اٹھائے پھرتی ہوں/ کہ ایک آدھ کٹوری/ دھوپ مل جائے/ تو شاید/ اس جنم کا سرما گذر جائے/ اور بادل ہیں کہ برسوں سے/ گرجتے ہی جا رہے ہیں/ یہ جو ایک ڈھیر ہے/ ملبہ ہے/ سوختہ خواہشوں کا/ آتما کی کپکپی/ ملبے میں دب جائیگی/ تو نے اے نصیب/ اچھا نہ کیا/ جو مجھے/ ہر منزل کی دہلیز سے/ لاحاصلی کی مالا پہنا کر/ لوٹا دیا۔

جیسا کہ مندرجہ بالا نظموں سے ظاہر ہے شبنم عشائی کے یہاں تنہائی اور اکیلے پن کا احساس ہم سفر کی بے رخی، دل آزاری اور ریاکاری کا بیان جا بجا ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں تشکیک Scepticism کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔

اب تم پہ شاعری ہو سکتی ہے/ کیوں کہ اب تم/ ہر بات کے ساتھ/ لیکن لگا لیتے ہو/ اور 'لیکن' دکھ ہے/ لیکن میرا من/ دکھ سے اتنا لبریز ہے/ کہ تم مجھ میں شاید/ سما نہیں سکتے/ بات مانو/ میری 'لیکن' میں چھپ کے/ کچھ پل تم بھی/ 'لیکن' کی دکھن جی لو۔

آدھی رات/ کوئی میری زمین پر اترتا ہے/ روشنیاں بکھیرتا ہے...... / جھلستی دھوپ میں/ سایہ بن کے/ پھیل جاتا ہے!/ دنیا کی بھیڑ میں/ وہ کتنا نمایاں ہے۔

پروین شاکر کی مانند شبنم عشائی بھی نرینہ عصبیت Male Chauvinism کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ انہیں اس معاشرے میں عورت قادر نہیں بلکہ تابع دکھائی دیتی ہے، انہیں بائبل کی اس حکایت پر قلق ہے کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور اس لئے غلامی کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے سوچ اور فیصلہ کرنے کی طاقت چھین کر دو وقت کی روٹی ملتی ہے۔ آنکھوں میں

چاندی کے سکوں کا کاجل لگایا جاتا ہے تا کہ وہ دیکھ نہ سکے اور مرد اپنے وجود کی ساری کڑواہٹیں نچوڑ کر اس کے گلاس میں بھر دیتا ہے اور اس کی حیات بدنما کو تار تار کر دیتا ہے۔

لڑکی/ جب اپنی تلاش میں نکلتی ہے/ اپنے دکھ خود بھوگتی ہے/ اپنے خواب خود بنتی ہے/ تو منافق/ اس کا مقدر/ غیبتوں سے بنتے ہیں/ خدا بھی مداخلت نہیں کرتا!/ یہ حیرانگی/ لڑکی کو فالج زدہ کرتی ہے/ اور وہ اپنی تلاش کھو بیٹھتی ہے۔

شبنم عشائی کو یہ بھی احساس ہے کہ عورت اپنے من کو مار کر ہی جی سکتی ہے۔اس کی جڑوں کو بار بار اکھاڑا جاتا ہے۔اسے خواب دیکھنے کی اجازت نہیں، زندگی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔وہ خود کو رشتوں کے پنجروں میں قید پاتی ہے اور یہ رشتے بھی محض مسہری اور دستر خوان تک ہی محدود رہتے ہیں۔دوسروں کو جینے دینے کیلئے عورت کو اپنا قتل کرنا پڑتا ہے پھر بھی وہ اس غلامی سے نجات پانے کی خواہاں ہے۔

وہ اپنے برے دنوں میں/ میری بڑی عزت کرتا/ بہت مان رکھتا/ اور روشن دنوں میں/ میری دل شکنی کر کے/ اس کا دل کامران محسوس کرتا/ اس غیر متوقع برتاؤ سے/ میں کوئی بغاوت تو نہیں کرتی/ لیکن آدرش ضمیر/ نیست و نابود ہو رہا ہے!/ اتنا بڑا سانحہ/ میں کہاں دفنادوں/ کہ میرے قدموں تلے/ اب کوئی زمین/ رہی نہیں/

مجھے زندگی جینے کی ممانعت ہے/ زندگی سے جوجھنے کی مجھے اجازت ہے/ میں بار بار کوشش کرتی ہوں/ ممانعت کے باوجود جینے کی/ ان کی چالاک چال کے سامنے/ میری کوشش کتنی بے کار ہے۔

ڈاکٹر شبنم عشائی کی شاعری میں روانی بھی ہے، اور مٹھاس بھی۔ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور وہ مبہم علامتوں کے استعمال سے پرہیز کرتی ہیں۔آخر میں زندگی کی بے ثباتی اور وجود کی لامعنویت پر لکھی ہوئی شبنم عشائی کی یہ خوبصورت نظم پیش کرتا ہوں۔

نہ جانے/ کیا خریدنے/ گھر سے چلی تھی/ کہیں کچھ بھی ایسا بازار میں نہیں/ جو دامن گیر ہوتا/ اب/ خالی ہاتھ/ تماشائی بنی/ ہر بازار سے/ گذر جاؤں گی/

۔۔۔دیپک بدکی (عصری شعور)

حالت سکر میں لکھا گیا ایک بے ترتیب، منتشر مضمون

'کتھارسس' کا انگلش میں جو مفہوم ہے اردو میں اسے کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

امڈ امڈ کر آنے والے جذبات کا اخراج، اظہار کہ نتیجتاً متوقع آثار کی کشمکش ظاہر ہو یا صورتحال میں دائمی راحت ملے۔

میں کوئی پیشہ ور نقاد یا دیباچہ نگار نہیں ہوں۔ میں ایک تخلیقی انسان ہوں۔ میں نے آج تک کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا۔ لیکن شبنم عشائی کی شدید خواہش تھی کہ میں اس کی کتاب ''کتھارسس'' کا دیباچہ لکھوں۔ جب اس کی خواہش میں اضطراب کا ایک سمندر موجزن دیکھا تو میں نے اس کی کتاب کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کر لیا...... دیباچہ لکھنے سے پہلے میں نے اس کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھا، اس کے زیر، زبر اور پیش کے ساتھ...... پھر جانے کیوں میرے من کے بھیتر بہت سا تصوف پڑھنے کی خواہش ہوئی...... اور میں نے تصوف کی ڈھیر ساری بھاری بھرکم گمبھیر کتابیں پڑھ لیں۔ یہ بھاری بھرکم گمبھیر کتابیں پڑھنے کی یوں ضرورت پیش آئی کہ شبنم، کشمیر کی رہنے والی ہے۔ کشمیر ازل سے سادھوؤں، سنتوں اور عارفاؤں کا مسکن رہا ہے، اور شبنم کی تخلیق کی مٹی اسی کشمیر کی ادھار دار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شبنم کی تخلیق کی آتما میں وہیں کی عارفائیں وشرام کرتی ہیں۔ ذرا شبنم کی یہ نظم پڑھئے اور دیکھئے کہ کس طرح وادئ کشمیر کا تصوف ایک قبر میں امڈ آیا ہے۔ اس کی چاہت بس ایک مٹھی خاک ہے۔ حوا ہے وہ آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے نکلی تھی جوان کی ہمدوش تھی۔ وہ للا عارفہ نہیں کہ کوئی تندور اسے پناہ دے...... اسے تو بس ایک مٹھی خاک کی ضرورت ہے جو اسے پنہاں کر سکے۔ شبنم کی نظم یوں ہے:

چھت تو نہیں دی مجھے/ میری قبر پر/ ایک مٹھی مٹی/ ضرور ڈالنا/ میں ڈھک جاؤں گی!/ تم/ میرا لباس ہوتے ہوئے بھی/ مجھے/ عریاں کر گئے/ میں للا عارفہ نہیں/ تمہارے اکیلے پن کو/ دور

کرنے کی خاطر/ تمہاری بائیں پسلی سے نکلی تھی/ تمہاری/ شریک حیات ہوں میں/ جو جنت میں/ تمہارے/ ہم دوش رہا کرتی تھی/ اس کی تصدیق/ تمہارے Tanenet نے نہیں/ قرآن کریم نے کی ہے/ تم اپنی پسلی کا گھاؤ لئے/ خاک بہ سر/ پھرتے رہو/ میں للا عارفہ نہیں/ کہ تندور مجھے پناہ دے/ میری قبر پر/ ایک مٹھی مٹی/ ضرور ڈالنا/ میں ڈھک جاؤں گی

....

اوپر کی نظم سے یوں تو ظاہر اًللا عارفہ کی اسے ضرورت نہیں لیکن پھر بھی نظم کے باطن میں للا عارفہ ہے/ اس کے بعد میں اک اور نظم کا حوالہ دونگا جس میں کشمیر کا سارا درد ایک جگہ جمع ہو گیا ہے۔
کوئی اسے سہلا رہا ہے، کوئی سینے سے لگا رہا ہے، کوئی ماں کی طرح اسے غم زدہ آنکھوں سے تک رہا ہے، کوئی سوگوار شفقت، آنکھوں میں آنسو بھرے باپ کی طرح تک رہا ہے...... کسی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دھر دیا ہے...... وہ آج کی رات سونا چاہتی ہے، ایسی نیند جو سچی ہو، بلیک میلنگ اور جھوٹ سے عاری نیند...... لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے درد پر وشواس ہے اور یہی وشواس ہی تو وہ ہے یعنی درد، مکمل اور شفاف درد......

میرے سارے درد/ آج یکجا ہیں!/ کوئی مجھے سہلا رہا ہے/ تو کوئی/ سینے سے لگا رہا ہے/ کوئی ماں کی طرح/ میرے سرہانے بیٹھا ہے/ تو کوئی باپ جیسی/ شفیق نظروں سے/ مجھے پڑھ رہا ہے/ کوئی دُکھ کے ٹکور دے رہا ہے/ تو کوئی بوسہ!/ درد ہی بس/ میرے ہیں/ میرے اپنے/ میرے سگے/ خدارا آج/ میرے اپنوں کی دنیا میں رشتوں کی کوئی بھیانک آواز/ نہ آنے دو/ مجھے کچھ پل/ درد کی آغوش میں/ ستانے دو/ یہ رشتوں کی طرح/ شک یا بلیک میل/ نہیں کرتے/ مجھے گلے لگا کے/ تھپکی دیتے ہیں/ یہ درد/ کتنے سگے ہیں!

قارئین! آپ نے نظم پڑھ لی۔ شبنم کی ایسی کئی نظموں کو پڑھنے کے بعد زبان مجبور ہو جاتی ہے، یہ کہنے کے لئے کہ شبنم عشائی اس وقت کی، اس دور کی، اب ایک اہم ترین شاعرہ بن چکی ہے۔
شبنم عشائی کی یہ کتاب کتھارسس، دراصل اس کی جیونی، کتاب زیست ہے اس کی۔
شبنم عشائی کی کچھ نظمیں پڑھنے کے بعد جانے کیوں مجھے سلویا پلاتھ اور فروغ فرخ زاد کی نظمیں یاد آنے لگتی ہیں۔ وہ بھی تا عمر اپنی نظموں میں کتاب زیست لکھتی رہیں۔ لیکن ان کی نظموں میں، ان کے جیون کی یاتراؤں میں بغاوت تو تھی ہی لیکن بے حجابی، عریانیت اور ہیجان بھی بلا کا تھا۔ سلویا

پلاتھ اور فروغ فرخ زاد بہت بڑی شاعرہ تھیں اوران کی زندگیوں کے تقاضے کچھ اور تھے۔لیکن شبنم کی زندگی کے تقاضے کچھ اور ہیں، وہ بھی باغی ہے لیکن اس کی بغاوت میں ایک دُشالا ایک چیزیا ایک کملی ضرور پنہاں رہتی ہے۔ان کی اس پنہاں والی کیفیت یاس کی ایک چیزیا شبنم کی تخلیق، زعفران کی کھیتی کرتی ہے۔درد پھولوں کے ساتھ۔تصوف اس کی تخلیق میں Intergrated ہے۔ تصوف سے آزاد ہوکے آپ اس کی شاعری کو پڑھ نہیں سکتے کہ یہ آپ کو جھنجھلا کے رکھ دے گی۔ تصوف اور صبوحی اس کی نظموں میں کس طرح کن لفظ و معنی میں در آیا ہے۔آیئے آپ بھی میرے ساتھ اس عمل میں شریک ہوں۔یوں تو سارے لوگوں نے تصوف اور صوفی کو اپنے اپنے سیاق وسباق میں سمجھا ہے لیکن میں اور میرا دل تصوف کی انتہا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ہی مانتا ہے۔

ماسوا رب اور مخلوق کی طرف دل لگانا یا نظر کرنا نشان ہلاکت ہے اور رب کی طرف رجوع ہونا علامت ملکیت ہے۔یہی تصوف کو ماننے والے کی شان ہے۔

صوفی کا دل ہر کدورت سے پاک ہو۔صفائی کی ضد، مکدر ہے۔مکدر دنیا ہونا صفتِ بشری میں داخل ہونا ہے اور صفت بشری سے بالاتر ہونا ہی تصوف کو دریافت رکھنا ہے۔صفائی، صفت بشریہ سے نہیں۔یہ اس لئے کہ بشر کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے اور مٹی کے خواص ذاتی میں کدورت وکثافت ہے۔اس لئے حصول صفا افعال واعمال سے نہیں ہوسکتا۔اور بشر کی صفت مجاہدہ وریاضت ہے جس کا زائل ہوجانا ناممکن ہے۔کیا خوب حضرت ہجویری نے اپنی لازوال شہرۂ آفاق کتاب 'کشف المجوب' میں لکھا ہے:

''صوفی وہ ہے کہ جب وہ اپنی ذات سے نابینا ہوجاتا ہے تو ذاتِ واجب کے ساتھ بینا ہوجاتا ہے۔صوفی وہ ہے جسکے پاس اثبات ہو جس کی نفی نہیں اور وہ نفی ہو جس کا اثبات نہیں۔

تصوف اسم اعظم نہیں۔یہ ایک خاص خصلت ہے۔یعنی تصوف اگر ایک رسمی چیز ہوتا تو ریاضت سے حاصل ہوسکتا تھا۔امر اُعلم ہوتا تو محض تعلم سے حاصل ہوجاتا۔تصوف ایک خاص خصلت ہے اور جب تک یہ خصلت خود اپنے اندر نہ پیدا کرے اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہوتا،

صوفی نہ کسی کا مالک ہوتا ہے نہ ملک نہ ملکیت''

تصوف اور صوفی کی پانچ تعریفوں کے اندر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کس طرح فقر، رقص، جامہ دری، وجد، وجود اور تواجد۔شبنم عشائی کے تخلیقی لاشعور سے مربوط ہوجاتے ہیں۔

کرنے کی خاطر/ تمہاری بائیں پسلی سے نکلی تھی/ تمہاری/ شریک حیات ہوں میں/ جو جنت میں/ تمہارے/ ہم دوش رہا کرتی تھی/ اس کی تصدیق/ تمہارے Tanenet نے نہیں/ قرآن کریم نے کی ہے/ تم اپنی پسلی کا گھاؤ لئے/ خاک بہ سر/ پھرتے رہو/ میں للا عارفہ نہیں/ کہ تندور مجھے پناہ دے/ میری قبر پر/ ایک مٹھی مٹی/ ضرور ڈالنا/ میں ڈھک جاؤں گی

....

اوپر کی نظم سے یوں تو ظاہر اً للا عارفہ کی اسے ضرورت نہیں لیکن پھر بھی نظم کے باطن میں للا عارفہ ہے/ اس کے بعد میں اک اور نظم کا حوالہ دونگا جس میں کشمیر کا سارا درد ایک جگہ جمع ہو گیا ہے۔ کوئی اسے سہلا رہا ہے، کوئی سینے سے لگا رہا ہے، کوئی ماں کی طرح اسے غم زدہ آنکھوں سے تک رہا ہے، کوئی سوگوار شفقت، آنکھوں میں آنسو بھرے باپ کی طرح تک رہا ہے...... کسی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دھر دیا ہے...... وہ آج کی رات سونا چاہتی ہے، ایسی نیند جو سچی ہو، بلیک میلنگ اور جھوٹ سے عاری نیند...... لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے درد پر وشواس ہے اور یہی وشواس ہی تو وہ ہے یعنی درد، مکمل اور شفاف درد......

میرے سارے درد/ آج یکجا ہیں! / کوئی مجھے سہلا رہا ہے/ تو کوئی/ سینے سے لگا رہا ہے/ کوئی ماں کی طرح/ میرے سرہانے بیٹھا ہے/ تو کوئی باپ جیسی/ شفیق نظروں سے/ مجھے پڑھ رہا ہے/ کوئی دُکھ کے ٹکور دے رہا ہے/ تو کوئی بوسہ! / درد ہی بس/ میرے ہیں/ میرے اپنے/ میرے سگے/ خدارا آج/ میرے اپنوں کی دنیا میں رشتوں کی کوئی بھیانک آواز/ نہ آنے دو/ مجھے کچھ پل/ درد کی آغوش میں/ استانے دو/ یہ رشتوں کی طرح/ شک یا بلیک میل/ نہیں کرتے/ مجھے گلے لگا کے/ تھپکی دیتے ہیں/ یہ درد/ کتنے سگے ہیں!

قارئین! آپ نے نظم پڑھ لی۔ شبنم کی ایسی کئی نظموں کو پڑھنے کے بعد زبان مجبور ہو جاتی ہے، یہ کہنے کے لئے کہ شبنم عشائی اس وقت کی، اس دور کی، اب ایک اہم ترین شاعرہ بن چکی ہے۔
شبنم عشائی کی یہ کتاب کتھارسس، دراصل اس کی جیونی، کتاب زیست ہے اس کی۔
شبنم عشائی کی کچھ نظمیں پڑھنے کے بعد جانے کیوں مجھے سلویا پلاتھ اور فروغ فرخ زاد کی نظمیں یاد آنے لگتی ہیں۔ وہ بھی تا عمر اپنی نظموں میں کتاب زیست لکھتی رہیں۔ لیکن ان کی نظموں میں، ان کے جیون کی یاتراؤں میں بغاوت تو تھی ہی لیکن بے حجابی، عریانیت اور ہیجان بھی بلا کا تھا۔ سلویا

پلاتھ اور فروغ فرخ زاد بہت بڑی شاعرہ تھیں اور ان کی زندگیوں کے تقاضے کچھ اور تھے۔ لیکن شبنم کی زندگی کے تقاضے کچھ اور ہیں، وہ بھی باغی ہے لیکن اس کی بغاوت میں ایک دُشالا ایک چیز یا ایک کملی ضرور پنہاں رہتی ہے۔ ان کی اس پنہاں والی کیفیت یا س کی ایک چیز یا شبنم کی تخلیق، زعفران کی کھیتی کرتی ہے۔ درد پھولوں کے ساتھ۔ تصوف اس کی تخلیق میں Intergrated ہے۔ تصوف سے آزاد ہو کے آپ اس کی شاعری کو پڑھ نہیں سکتے کہ یہ آپ کو جھنجھلا کے رکھ دے گی۔ تصوف اور صبوحی اس کی نظموں میں کس طرح کن لفظ و معنی میں در آیا ہے۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ اس عمل میں شریک ہوں۔ یوں تو سارے لوگوں نے تصوف اور صوفی کو اپنے اپنے سیاق و سباق میں سمجھا ہے لیکن میں اور میرا دل تصوف کی انتہا حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ہی مانتا ہے۔

ماسوا رب اور مخلوق کی طرف دل لگانا یا نظر کرنا نشان ہلاکت ہے اور رب کی طرف رجوع ہونا علامت ملکیت ہے۔ یہی تصوف کو ماننے والے کی شان ہے۔

صوفی کا دل ہر کدورت سے پاک ہو۔ صفائی کی ضد، مکدر ہے۔ مکدر دنیا ہونا صفتِ بشری میں داخل ہونا ہے اور صفت بشری سے بالاتر ہونا ہی تصوف کو دریافت رکھنا ہے۔ صفائی، صفت بشریہ سے نہیں۔ یہ اس لئے کہ بشر کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے اور مٹی کے خواص ذاتی میں کدورت و کثافت ہے۔ اس لئے حصول صفا افعال و اعمال سے نہیں ہوسکتا۔ اور بشر کی صفت مجاہدہ و ریاضت ہے جس کا زائل ہو جانا ناممکن ہے۔ کیا خوب حضرت ہجویری نے اپنی لازوال شہرۂ آفاق کتاب 'کشف المحجوب' میں لکھا ہے:

''صوفی وہ ہے کہ جب وہ اپنی ذات سے نابینا ہو جاتا ہے تو ذاتِ واجب کے ساتھ بینا ہو جاتا ہے۔ صوفی وہ ہے جسکے پاس اثبات ہو جس کی نفی نہیں اور وہ نفی ہو جس کا اثبات نہیں۔

تصوف اسم اعظم نہیں۔ یہ ایک خاص خصلت ہے۔ یعنی تصوف اگر ایک رسمی چیز ہوتا تو ریاضت سے حاصل ہو سکتا تھا۔ امر اعلم ہوتا تو محض تعلم سے حاصل ہو جاتا۔ تصوف ایک خاص خصلت ہے اور جب تک یہ خصلت خود اپنے اندر نہ پیدا کرے اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہوتا،

صوفی نہ کسی کا مالک ہوتا ہے نہ ملک نہ ملکیت''

تصوف اور صوفی کی پانچ تعریفوں کے اندر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کس طرح فقر، رقص، جامہ دری، وجد، وجود اور تواجد۔ شبنم عشائی کے تخلیقی لاشعور سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

سو سال یا اس سے اُدھر کی بات ہے کہ ہندوستان میں ایک رسم بہت عام تھی۔ستی کی رسم۔ جب کسی عورت کا خاوند مرتا تھا تو اس کے ساتھ عورت خود اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیتی تھی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تھی تو اسے زبردستی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ آگ کی نذر ہو جائے اور اس کے خاوند کے ساتھ اس کی بھی استھیاں تیار ہو جائیں۔

یہ واقعہ ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ ''عجائب الاسفار'' میں لکھا ہے کہ کس طرح اس نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بے ہوش ہو گیا۔

خارجی ادب میں سلویا پلاتھ اور فروغ فرخ زاد نے بھی Intellectually ادب کو اپنا 'پتی' مان کر اپنے آپ کو ان گنت بار 'ستی' کیا ہے۔اسے خود کو زندہ جلانے کا بہت شوق ہے اور اس سے وہ ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوتی بلکہ Intellectually اور Powerful ہو جاتی ہے۔اس کے اس ستی ہونے میں مجھے اس Surrealism میں وہ کیفیت وجد اور تواجد نظر آتا ہے جو خوشی سے ہو یا غم سے یا تکلیف سے یا آرام سے یا وجود دل سے جو غم کا آکہ ہے۔واجد کی صفت یہ ہے کہ بحالت حجاب جوشِ شوق کے سبب وجود میں آئے۔ موجودہ کتاب کی خالق شبنم عشائی اس وقت اردو کی ایک اہم ترین شاعرہ ہے۔اس نے اپنی موجودہ کتاب میں Surrealistic شاعری کے ذریعہ جو تصوف اخذ کیا ہے اس پر حجاب کی ایک جھینی جھینی چیز یا تو دکھائی دیتی ہے، مکڑی کا جالا تو نظر آتا ہے لیکن مکڑی نظر نہیں آتی۔شاعری کی پہلی غیر مانوس اور بڑی خوبی یہ ہے جو اس کی شاعری میں ہے یعنی وجد اور وجود کی Surrealistic کیفیت یہ Surrealistic کیفیت ان کو دوسرے شاعروں سے علیحدہ کرتی ہے۔اجنبی اور غیر مانوس بناتی ہے اور دل کی دھڑکنوں کے اندر بھی یہ شاعری نظر آتی ہے...... آیئے موجودہ کتاب کی پہلی دس نظموں کا مطالعہ کریں کہ اس کی Surrealistic کیفیت میں کس طرح وجد، وجود اور تواصل ظاہر ہوا ہے۔یہ تو سب ہی جانتے ہوں گے کہ وجد اور وجود مصدر ہیں۔ایک کے معنی غم اور دوسرے کے معنی پانے کے ہیں۔جب دونوں کا فاعل ایک ہو، تو سوائے مصدر کے کوئی اور فرق نہیں رہتا۔وجد اس غم کو کہتے ہیں جو غیر کی محبت کی وجہ پر ہو۔وجد کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ وہ الم ہے اور اسے دیکھنے کے بعد الم کو قلم میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وجد طلب اور مطلوب میں ایک سری راز ہوتا ہے جس کا بیان کشف غیر میں ہوا ہے۔ اور کیفیت سے وجود شان ہے اور اشارہ کا اس میں دخل نہیں۔کیونکہ یہ مشاہدہ ہے خوشی ہے اور خوشی طلب میں نہیں ملتی۔وجود ایک فضیلت ہے جو لوگوں سے محب کو ملتی ہے اس میں اشارہ کو دخل نہیں۔حضرت

عثمانی ہجویری کے نزدیک وجد الم دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثالیں حاضر ہیں:

تعبیریں اتنی بھیانک ہیں/ خواب سہانے کیوں تھے؟/ سہانے خواب/ سہانے دنوں کی طرح/ رات کی سیاہی میں/ کھو کیوں نہیں جاتے؟/ رات اپنی سیاہی میں/ رازوں کو چھپا لیتی ہے/ دلوں کے زخم/ اپنی سیاہی سے کیوں نہیں بھرتی؟/ زبانوں کے زخم/ دلوں کی توڑ پھوڑ کرنے سے/ باز نہیں آتے/ کسی لہجے میں اتنا ظرف نہیں/ کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیں/ ٹوٹے ہوئے دل بھیانک تعبیروں کو/ دانتوں سے جی لیتے ہیں/ پر ہر دھڑکن پوچھتی ہے/ کہ خواب سہانے کیوں تھے؟

اوپر میں نے 'ستی' ہونے کی بات کی تھی۔ شبنم عشائی کس طرح تخلیق کو اپنا پتی مان کر Intellecrually ستی ہونا چاہتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، شبنم عشائی کی شاعری اس مخصوص تصوف کے جذبات کی تخلیق ہے۔ جس کی ایک مثال للاعارفہ کی شاعری ہے۔ جہاں تک شبنم عشائی کی اپنی فکر ہے، وہ وجد اور وجدان کے ساتھ ایک طرح سے ایسے حزن کا آئینہ ہے جو حسن کو اور زیادہ معنی خیز بنا دیتا ہے۔ یہی معنی خیزی شبنم کی نظموں کا اصلی احوال ہے۔ شبنم مکمل طور پر ایک حزنیاتی کیفیت کو اپنی نظموں میں اس طرح پیش کرتی ہے، جو وجود کا فلسفہ اور زندگی کا طور ہے۔ غور کیا جائے تو یہ کیر کے گارڈ کے فلسفہ کا اثر ہے۔ شبنم نے وجودی فلسفہ پر ریسرچ کی ہے، ان کا تھیسس (Thesis) شائع ہو چکا ہے۔ اس میں بھی کیر کے گارڈ اور سارتر کے بہت سے حوالے موجود ہیں۔ وجودی فلسفہ کی ایک بنیاد وجود کی تلاش اور شناخت تھی تو دوسری جانب اس انسان کی تلاش جو آج دنیا میں مفقود ہو چکا ہے۔ جو محض ایک مثال ہو کر رہ گیا ہے۔ عمومیت میں اس طرح گم ہوا ہے کہ اس کی شناخت ہی ممکن نہیں۔ سوچنے والے تخلیقی ذہن کو اس کی تشویش ہے۔ اس لئے شبنم ایک نظم میں اس کا اظہار اس طرح کرتی ہے:

جانے/ کہاں دب گئے ہیں/ انسان کی کھوج میں/ میرا چہرہ/ پتھر ہو گیا/ جانوروں کی/ بھیانک آوازوں میں/ میں نے میری آواز کھو دی/ پتھر چہرہ/ بن آواز کا وجود/ کتنا بھیانک ہو گا/ تمہیں معلوم بھی ہے؟/ جو ہے تو/ دیکھتے کیا ہو/ تم تو خدا ہو!

شبنم عشائی کی دیگر نظموں کی طرح اس نظم کا بھی کوئی عنوان نہیں ہے۔ ایسے تخلیق کار جو اپنے انفرادی احساس کو تخلیق میں جاری و ساری رکھتے ہیں، ان کی نظموں میں عام طور پر عنوان نہیں ہوتے یہ بھی شبنم کی انفرادیت ہے۔ اس لئے کہ شاعری کا کوئی خاص عنوان نہیں ہوتا اور نہ کوئی موضوع

ہوتا ہے۔ نظمیں تو اس لئے ہیں کہ وہ اسکا وجود ہیں، اس میں موضوعات تلاش کرنا لا حاصل ہے۔

اس تناظر میں وادیٔ کشمیر میں ریشیت کی روایت کو بھی یاد رکھنا ہوگا۔ ریشیت تصوف کی ایسی کیفیت ہے جس میں صوفی کا وجود اپنی کائنات میں اس طرح پیوست ہو جاتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ ایک منفرد فکر ہے جو وادیٔ کشمیر کے تصوف کیلئے ہی مخصوص ہے۔ شبنم کی فکر پر ریشیت کا بڑا گہرا عکس موجود ہے۔ وادی کشمیر خود اپنے منظر نامے کے لحاظ سے قدرت کی شاعری ہے۔ حزن زدہ صبح و شام دھرتی کا بے پناہ نکھرا ہوا جوبن، خاموش اور پُرسکون گھری ہری وادی، جس کے قلب میں اضطراب بھی ہے اور تشکیک بھی۔ بہت سے سوالات ہیں جو منظروں میں نمایاں ہیں۔ اسی تمام اضطراب کو شبنم نے بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے، اور لسانی سطح پر اضطراب کو سوالوں کے گرداب بنا دیا ہے۔ شبنم کے یہ سوالات کچھ یوں نمایاں ہوئے ہیں:

جانتے ہو/ تمہاری ایک تخلیق کو/ کسی خیال/ کسی من/ نہ کسی گھر میں/ جگہ ملی/ جہان فانی میں/ سرگرداں/ خاک بسر/ پھرتی رہی/ جانتے ہو/ تمہاری ایک تخلیق کی/ جیب میں/ مکاری کا کوئی/ سکہ نہیں/ کہ وہ روٹی/ یا رشتے سے/ آشنا ہو/ کائنات میں/ تمہاری ایک تخلیق/ ایسے اکیلی ہے/ جیسے تم!

تنہائی صرف کائنات کا یا کائنات میں زندگی گزارنے والوں کا نہیں خود کائنات بنانیوالے کا بھی مسئلہ ہے۔ اور یہ مسئلہ شبنم عشائی کو ایک وجودی فکر محسوس ہوتا ہے۔ اور یہی احساس ان کی شاعری بن جاتا ہے۔

شبنم عشائی نے اپنی شاعری کے پہلے مجموعے سے تازہ ترین مجموعے تک اپنے اسی تجسّس کو برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے عمومی سطح پر اتر کر کبھی شعری محفلوں یا رسالوں سے مصالحت نہیں کی۔ اپنے ردم کو برقرار رکھا۔ سست روی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہنا اور شبنم نے اپنی تخلیق کو، نئے زمانے کی روش کی طرح تیز رفتار بنانے کی کوشش نہیں کی۔

آئی۔ اے۔ رچرڈ نے اپنے ایک مضمون میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کوئی ایک نظم کہاں مکمل ہوتی ہے یا اس میں کتنا حصہ فالتو ہے۔ اس کا تعین بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ مسئلہ قاری کی تفہیم اور تخلیق کار کے احساس کا ہے۔ اس لئے اس کا حق کسے حاصل ہونا چاہئے۔

شبنم عشائی کی نظمیں اس کا بڑا مکمل جواب اور جواز ہیں۔ وہ نظم کو اپنے ٹھہرے ہوئے ردم سے شروع کرتی ہیں، پھر آہستہ روی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں، اور آخری مصرع تک پہنچ کر اچانک

احساس ہوتا ہے کہ نظم مکمل ہوگئی اور چونکانے والی کیفیت کو پڑھنے والے کے احساس پر چھوڑ دیتی ہیں۔ مثلاً:

تیری دنیا میں/ کوئی دکھ مٹتا نہیں/ شبد کی چوٹ/ کون سہلائے!/ میرے من میں/ شبد کی چوٹ لگی ہے/ چوٹ رستی ہے/ دکھ پلتا ہے/ اپنوں سے بھی/ اپنا لگتا ہے/ خواب بھی رِسنے سے پہلے/ پلتے ہیں/ تم نے بن دیکھا خواب پال کے/ کائنات بنائی/ تمہاری کائنات کے گھاؤ کی/ کتنی مسافت میں دکھ سن ہو جائیں گے؟/ تمہاری کائنات کے/ کس کونے میں/ دکھ سن ہو جائیں گے؟

اس نظم کو پڑھتے ہوئے دو مقامات پر یوں لگا کہ نظم یہاں پوری ہوگئی۔ تاہم اگلا مصرع پھر سے نظم کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا ہے۔ نظم آگے بڑھتی ہے اور بالآخر نظم کی طرح احساس بھی سن ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبنم عشائی کی شعری کائنات میں ایک ایسی وادی موجود ہے جو کشمیر کی طرح بظاہر پرسکون ہے تاہم اس کے سکون میں تشویش و اضطراب کے خاموش سمندر موجزن ہیں۔ دہکتے ہوئے تندور ہیں، جن میں شیخ نورالدین بصد آرام جلوہ گر ہیں، للا عارفہ برہنہ ہے، لیکن عام نظریں اس کے مشاہدے سے محروم ہیں۔

شبنم عشائی بھی للا عارفہ ہے۔ للا عارفہ کا دکھ ان کا لباس ہیں۔ اس لئے اس کا اضطراب اس کتھارسس کی جستجو میں ہے جس کو عرصہ ظہور تک پہنچنے میں بھی کئی مدوجزر اور باقی ہیں تب کہیں ایک پرسکون سمندر کا منظر سامنے آئے گا۔

۔ صلاح الدین پرویز (کتھارسس)

شبنم عشائی کے حوالے سے۔۔۔

۱

جسم کے پنجرے میں قید
روح کا زخمی پرندہ
پھڑپھڑاتا ہے
زخموں کے اندمال کے لیے
اُسے تازہ ہواؤں کی تلاش ہے
یا پھر صحراؤں کی گرم ریت
کا آرزومند ہے!

۲

تم اپنی اندھی آنکھوں کو
شمع سے روشن کر کے
لامتناہی انتظار کرتے کرتے
پتھر کے بت میں تبدیل ہو چکی ہو
شمع بجھا دو
ورنہ حرص وہوس کی دنیا
تمہیں دیوی بنا کر
مندر میں آسن پر بٹھا دے گی

۳

یہ کون نغمہ سنج ہے؟
شائد فضا کا رقص کرتے ہوئے
نٹ راج کے ہونٹوں پر
تمھاری غیر مرئی شاعری کی
سرگم جاگ رہی ہے

۴

تم لاحاصلی میں حاصل کا موتی
تلاش کرتی ہو
تم شکست میں
فتح کا چہرہ دیکھتی ہو
تم ڈوبتی سانسوں میں
زندگی کا رمز ڈھونڈتی ہو

۵

تم نے بیراگ کو وصل کا
پیراہن اُڑھا دیا ہے
تمھاری چنری کے سات رنگ
پرندوں کی طرح نغمہ سنج رہتے ہیں
اور ملال کی بدلیوں میں
کھونے سے پہلے
چاند کی کشتی میں بیٹھ کر
سات سماوات کی
سیر کو نکل جاتے ہیں

۶

گلاب کا پھول
تمہارے بدن کی خوشبو
خود میں سمٹنے کے لئے
شاخ سے لپٹا رہتا ہے
کہ تم سیرِ چمن کے لئے آؤ
تو وہ تمہاری زلفوں کے گھونسلے میں
منھ چھپا کر آرام کی نیند سو جائے
کبھی نہ جاگنے کے لئے

۷

کیا تم جانتی ہو!
تمہاری شاعری کے پسینے میں
نافے کی خوشبو بسی ہوئی ہے

۸

موت کے ساز پر
تم زندگی کا نغمہ گاتی ہو
شاخِ نہال غم تمہاری شاعری
کا جاری استعارہ ہے
تم آنسو رنگ ساون کی
آگ نظم ہو

۹

مجھے جب نیند نہیں آتی
میں تمھاری شاعری کی
رِدا اوڑھ کر
سوجاتا ہوں

۱۰

تم زندگی کی کُٹیا میں
آگ جلائے تن تنہا بیٹھی
اپنے زخموں کو پیار سے
دُلارتی ہو
کہ فراق کے کانٹوں میں
وصل کی لذت پنہاں ہے

۱۱

تم نے لفظوں کی نئی بوطیقا
رَچی ہے
تم خوشی میں الم
اور الم میں خوشی تلاشتی ہو
تمھاری شاعری مسکراتی ہے
تو مونالیزا کے ہونٹوں پر
حزن وملال کی بدلیاں
کھیلنے لگتی ہیں

۱۲

تم فنا میں بقا
اور بقا میں فنا دیکھتی ہو
تم نے میرا کی طرح
بیراگن کا روپ دھار لیا ہے

۱۳

تمھاری شاعری
دعائیہ گیتوں کی
"سمفنی" بن کر
میرے دل میں
گونجتی رہتی ہے

۱۴

تمھاری شاعری
گلدان میں سجے
باسی پھولوں کو
تازگی، ندرت اور
تحیر کے احساس سے
بھر دیتی ہے

— فیاض رفعت، لکھنؤ

ایک ستارہ سا شب زمین سے اٹھا

Who looks outwards. sleeps, who looks inwards, awakes.

—Carl Jung

شبنم عشائی کی تخلیقی سانسوں کا شمار

شبنم عشائی کی شاعری میں 'لل تراگ' کی کچھ بوندیں ہیں جن کی وجہ سے ان کی شاعری میں شیفتگی رفتگی اور جذب وجنون کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

کن سوچوں میں ڈوبے ہو/ ہاں/ میں اسی پانی کی بوند ہوں/ جو تمہارے کمرے کے کونے میں پڑی/ صراحی میں رہتا تھا، آخر کار/ تمہارا سمندر/ نہ جانے کتنے دریاؤں کا/ پیاسا تھا اور/ جگ جگ پھرتا تھا/ میں/ ہر شام/ صراحی کی حدیں پار کرتی/ تمہارے ہونٹ/ طراوت کے ذائقے لیتے/ جگ جگ پھرنے کی/ تھکن مٹ جاتی/ پر ہر جگ سے لایا گیا گیان/ تمہیں سوئم بھگوان بنا گیا! / پھر تمہارے/ پتھریلے ہاتھ اٹھے/ کونے میں پڑی صراحی/ توڑ بیٹھے اور/ چوٹ/ پانی کو لگی/ بوند بوند درد سے تڑپ اٹھی/ سر پٹکنے لگی/ تم اپنی سوکھی آتما کو لے چلو یہاں سے/ کن سوچوں میں ڈوبے ہو/ میں اسی پانی کی بوند ہوں/

لل دید کے واکھوں اور شبنم عشائی کی نظموں میں کچھ مماثلت ہے۔ وہی درد، آنسو، تنہائی، بے اعتنائی، بیزاری، اضطراب والتہاب اور دل شکستگی (Dispondency) ہے جس نے لل دید کی زندگی کا محور ومنہج تبدیل کر دیا تھا۔ شبنم کی شاعری میں بھی لل کی طرح شیو کی تلاش کا عمل متحرک اور رقصاں ہے۔ اسی لئے دل کے دروں میں قوت اور محبت کے مظہر شیو کیلئے اس قدر شکیبائی اور اضطراب ہے۔

شبنم عشائی بھی دھیان میں گم، للا عارفہ کی طرح اپنی سانسوں کا شمار کرتی ہیں اور ذہنی کیفیت بھی ان ہی کی طرح ہے جو ننگے بدن سے زیادہ روح کی عریانی سے پشیماں ہیں:

تمہاری رضا کو لوگ/ میری خطا کہتے ہیں/ میرے ہاتھوں سے وہ پوشاک/ چھین لی گئی/ جو میں پہننے والی تھی/ اور پہنی ہوئی پوشاک/ میں اتار چکی تھی/ میرے سارے آنے والے موسم/ منسوخ کر دیئے گئے تھے/ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا/ اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا/ مجھے اتنی ایذا دی گئی/ کہ ارمانوں کا ریشم کا تنا/ اب میری برداشت سے باہر ہے/ اور پھر موسم منسوخ نہ ہوتے/ پھول ریشم بٹورتے/ میری عریانی ڈھک جاتی/ تمہاری تابعداری میں/ میں نے اپنی مٹھی کبھی کھول کر نہیں دیکھی/ کون اپنے خواب کا/ ایک ٹکڑا کاٹ کر/ میری عریانی ڈھانپ دے گا/ لاؤ میں اپنے ہاتھ کی لکیریں مٹا دوں/

جس طرح لل دید کے حصے میں پتھر ہی پتھر تھے، اسی طرح شبنم عشائی کے نصیب میں وہی سنگ خارا ہیں جو احساس اور ان کی تخلیق کے سینے کو مضروب اور مہمیز کرتے رہتے ہیں۔ شبنم عشائی کی شاعری میں درد کے heat waves کو ہر حساس فرد محسوس کر سکتا ہے۔ وہی درد جو لل کے وجود کا استعارہ تھا اور جس درد نے اسے آشفتہ سری اور جرأت عطا کی تھی، شبنم عشائی کی شاعری کی شریانوں میں بھی دوڑ رہا ہے:

شبنم عشائی کی شاعری میں درد کے مربوط سلسلے ہیں اور درد کی زمین سے ہی ان کے اظہار کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔ شبنم عشائی کی ایک نظم ہے:

مجھے میرے من کی قبر میں ہی پڑھ لو/ ناول نہیں/ ایک درد ہوں میں/ جو زندگی سے/ زیادہ پتھریلا ہے/ درد کبھی بھی تمہارے من سے مل سکتا ہے/ بس طوفان کا/ کوئی حلف نہیں اٹھانا

....

تناؤ میں حویلی سے نکلی/ ۶۰ روزہ منکوحہ/ ہر گاندھین کے/ ۹۰ سال/ خاموشی سے پیستی ہے/ بدلاؤ کا کرب/ روح پہ لکیریں کھینچتا ہے/ کاغذ پہ کھینچی لکیروں میں/ کوئی کھویا ہوا اپنا/ دفن نہیں ہوتا

....

شبنم عشائی کی شاعری کے بین القوسین میں درد کی لہریں ہی موجزن ہیں۔ ان کے ہاں جو درد کا داخلی طوفان (Inner storm of torment) ہے وہ ان کے شعری، تخلیقی بیانیہ سے مترشح ہے،

تضادی وجود کو تسلیم کرنے میں بھی ایک درد ہی ہے۔ان کے یہاں جو تضادات کا تناؤ ہے وہ وجود کی واقعیت کا اظہار ہے۔زندگی کی ایک گرداب ہے اور اسی گرداب کی تعبیر یہ نظمیں ہیں جو مختلف موجوں اور لہروں کے ساتھ ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں۔

شبنم عشائی کی نظموں میں کیفیتیں ہزار ہیں اور ہر کیفیت ان کے ذہن کے موسم اور مافیہ کا کشاف ہے۔اس میں وجود کے حوالے سے خود سپردگی بھی ہے، تکرار بھی۔اقرار بھی ہے، انکار بھی۔وصل جاناں بھی ہے، آتش ہجر بھی۔موج خیز جذبات بھی ہیں، شبنمی احساسات بھی۔انہوں نے اپنے وجود کے سارے حوالے، کائناتی وجود کے حوالوں سے مربوط کر دیئے ہیں۔یہ گویا صرف اپنے وجود کی کہانی نہیں ہے بلکہ کائنات کے ہر اس حساس وجود کی کہانی ہے جس پر یہ کیفیات طلوع اور غروب ہوتی رہتی ہیں۔اس میں کئی طرح کے رس اور بھاؤ ہیں۔اس میں "رتی بھاؤ" ہے، سنجوگ اور ویوگ ہے۔وہ سارے رس اور عناصر جن سے انسانی وجود عبارت ہے، وہ شاعری میں موجود ہیں۔

دل کے دوار کا اور من کے متھرا میں جو شاعری بسائی جا سکتی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہوتی ہے جیسی شبنم عشائی کی ہے۔کہیں کہیں شبنم میرابائی بن جاتی ہیں،، تو کہیں دمن جیسی باغی، لیکن شاعری میں باغیانہ لہجہ اور احتجاج مکمل تمکنت اور وقار کے ساتھ روشن ہے۔

(۲)

ملک یونان کے شہر اتھینز کے ایک پارک میں سقراط کا ایک قول جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے "اپنے آپ کو جانو" سقراط کے اس جلی جملے کی خفی صورت شبنم عشائی کی شاعری میں نظر آتی ہے۔شبنم کی شاعری بھی ذات کی معرفت سے ہی عبارت ہے۔'میں' سے آشنائی کائنات کے گیان کیلئے ناگزیر ہے۔دراصل اسی 'میں' سے آدمی اس سچ کو پا سکتا ہے جو آتما کی آنکھوں میں بسا ہوتا ہے۔سقراط نے اپنے آپ کو جاننے میں ہی پوری زندگی گذار دی اور یہی مناجات کرتا رہا کہ اے خدا میرے ظاہر و باطن کو ایک کر دے۔من اور بانی کا فرق مٹا دے۔میرے اندرون کو خوبصورتی سے بھر دے۔شبنم عشائی کی شاعری بھی اپنی ذات کی معرفت کا ایک وسیلہ ہے۔

باطن کے موسم پر ہی خیال کا انحصار ہوتا ہے۔اس لئے انہوں نے اپنی شاعری میں اپنی

اندرونی کیفیت کا ہی اظہار کیا ہے کہ تخلیق دراصل سیلف ڈسکوری ہے۔ اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی ایک کوشش۔

'میں' کے متواتر قتل یا 'میں' کی موت سے جو ایک ردعمل ہو سکتا ہے وہ پوری شدت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ شبنم عشائی نے 'میں' اور اس کے اضطراب کو ہر سطح پہ زندہ رکھا ہے۔ دراصل یہی ان کی زندگی اور ان کے وجود کا جواز بھی ہے:

ہاں میرا میں/ کتنے جنم لے چکا تھا...... وہ جب پہلی بار قتل ہوا تھا/ تو ایک بنجر ساحل پر/ کئی روز پڑا رہا/ پھر ایک دن کیا دیکھا/ سورج پر کوئی ہنس رہا ہے/ یہ میرا 'میں' تھا/ روپ بدل چکا تھا/ پتھر ہو گیا تھا میرے دوسرے 'میں' کے قتل پر/ ایک اور تخلیق پا گیا/ میرا تیسرا 'میں'/ کالی صدیوں کا/ ایک گونگا ہے/ جو صدیوں کی سرگوشی سننے/ روز سمندر میں چھلانگ لگاتا ہے/ سفید جھاگ میں ملبوس/ میرے پہلو میں آ کر بیٹھ جاتا ہے/ اور پوچھتا ہے کہ تم کون ہو/ میں پھر سوچتی ہوں/ میں تو جب ہی کی قتل ہو چکی ہوں/ میں کون ہوں/ کیونکہ ہر قتل نے/ ایک نئی تخلیق کو جنم دیا/ تو کیا میرا 'میں'/ ہر قتل کے بعد تخلیق پایا ہے/ ہر قتل ایک تخلیق ہے/ تو کیا ہر قتل یہ نہیں بتاتا/ کہ میں جی کیوں رہی ہوں!

شبنم عشائی کی نظموں میں احساس کی کئی سرحدیں ہیں۔ کہیں آشفتگی ہے تو کہیں آسودگی، کہیں خستگی ہے تو کہیں دل بستگی، کبھی سوزِ سینہ سے داغ ہے تو کبھو درد و غم سے فگار، کبھی سراپا آرزو تو کبھی سراپا بیزار:

آدھی رات/ کوئی میری زمین پر اترتا ہے/ روشنیاں بکھیرتا ہے....../ جھلستی دھوپ میں سایہ بن کے/ پھیل جاتا ہے!/ دنیا کی بھیڑ میں/ وہ کتنا نمایاں ہے

....

تجھے/ دیکھ کے/ یوں لگتا ہے/ جیسے چاند اترا ہو/ مری زندگی کی/ سیہ راتوں میں/ جس کی شفاف خنک کرنوں سے/ میرا وجود/ روشن ہوا جاتا ہے/ تو/ میری روح کا/ نغمہ/ تیری ذات سے/ آباد/ میرا وجود

....

کھونا نہیں/ جینا چاہتی تھی/ تمہاری/ بانہوں کے چھوٹے سے حصار میں

جب تم نے/ اپنی رفاقت سے/ اس کی افشاں/ بھری تھی/ ایک/ نئے پن کی خوشبو سے/ فضا معطر ہوئی تھی/ اور وہ/ تمہاری روشنی میں/ نہائی تھی/ پھر/ تم اور وہ/ دھند کی مہین لہر جیسے/ ایک دوجے کے/ رگ و پے میں// سرایت کرنے لگے

بس ان کے وجود کی تعبیر یہ ہے کہ اس میں نہ تاب ہے، نہ قرار ہے، وصال کی تڑپ، ملن کی آرزو ہے۔ ان کی نظموں میں راہ عشق کی دونوں منزلیں 'وصل' اور 'ہجراں' روشن ہیں۔

شبنم عشائی کی شاعری کا ایک رنگ وہ ہے جب دل بستگی کا ساماں تھا، وصل کی راحتیں تھیں اور ایک رنگ وہ ہے جس میں 'خستگی اور شکستگی، پامالی کا احساس ہے۔ شبنم عشائی کی شاعری میں ایک موڑ وہ بھی آتا ہے جب وہ مکر و فریب اور منافقت سے آلودہ زندگی کو دیکھتی ہیں اور انہیں اپنی معصومیت، محبت کی شکستگی اور ایثار کے انہدام کا احساس ہوتا ہے۔ عورت تو اپنی ذات کے آئینے میں ہی کائنات کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور جب اس کا آئینہ شکستگی سے دوچار ہوتا ہے تو دل کے آئینے کی کیفیت بھی تبدیل ہونے لگتی ہے۔ شبنم عشائی جس درد کے صحرا سے گذری ہیں، اس میں ایسی ہی شاعری کا ظہور ہوسکتا ہے اور کیفیت میں ایسا ہی اضطراب جنم لے سکتا ہے جو ان کی شاعری کے ساتھ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ شبنم عشائی باوجود اپنی فطری معصومیت اور جذبہ ایثار کے انتقامی اور احتجاجی لہجے میں بات کرنے لگتی ہیں۔

شبنم عشائی کے اس تیور میں گویا پنجم سر میں سورج کی گنگناہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ سورج کے سینے کی جوالا مکھی، اس شاعری کے سینے میں بھی دہکتی نظر آتی ہے:

تم جان لو کہ دنیا سوچنے سے عبارت ہے/ اب زندگی کی سگریٹ صرف میں پیوں گی/ اور تم سگریٹ کی راکھ کی طرح/ میری انگلیوں سے جھڑتے رہو گے۔

دراصل وقتی اور جذباتی ابال اور طغیان و جولان کی وجہ سے ذہن کی موجوں میں اضطراب پیدا ہوتا رہتا ہے۔ شبنم عشائی نے اپنے جذباتی ہیجانات کو جو اظہاری شکل عطا کی ہے اور تخلیقی فضا قائم کی ہے۔ اس میں وہ مکمل طور سے کامیاب نظر آتی ہیں۔

ان کا تخاطب یا تو اپنی ذات ہے، اپنی تقدیر ہے یا پھر اپنی ذات ہی میں مدغم کوئی اور پیکر جو بار بار اس سے جدا ہوتا ہے اور اسے تنہائی کے صحرا میں چھوڑ جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات میں جس وجود کو بسایا ہوا ہے، اس وجود کے فریب نے ہی اس کے احساس و اظہار

کی شکلیں اور صورتیں بدل دی ہیں۔

شبنم عشائی کی نظموں میں خود سوانحی عناصر زیادہ ہیں، جو واردات اور سانحات ان کی ذات پر وقوع پذیر ہوئے، ان واردات کا اپنے تخلیقی فائل میں اندراج کرتی رہیں اور اظہار کی صورت عطا کرتی رہیں۔ شبنم عشائی کی شاعری اور شخصی زندگی کے مابین زیادہ حد فاصل نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مربوط اور متراکم ہیں۔ شاعری گو کہ ایک شخص کی ہے مگر اس میں مختلف کیریکٹر موڈ کی شکلیں ہیں۔ یعنی ایک کرداری ہوتے ہوئے بھی یہ شاعری کثیر کرداری ہے کہ انسان بنیادی طور پر اپنے دروں اور بیروں شکلوں کے ساتھ کئی حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ وجود کی یہ تقسیم ذہنی تخیلات کو تعینات سے ماوراء کر دیتی ہے اور ایک ہی شخص کی گفتگو مختلف ہیئت واشکال میں سامنے آتی ہے۔ شبنم کی شاعری میں جتنے بھی کردار ہیں، دراصل وہ ایک ہی کردار کی ذہنی کیفیتیں اور صورتیں ہیں۔

شبنم عشائی کی شاعری شکستہ خوابوں اور شکستہ بازوؤں کی شاعری ہے جس میں زندگی کی تلخیوں اور اس کی خارشگافیوں کا بیان ہے، جس میں داخلی آزار کا اظہار ہے۔ اس دل شکستگی نے شبنم عشائی کو فطرت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے وجود کی تجسیم (personification) کبھی درخت سے کرتی ہیں تو کبھی مہاجر پرندوں سے۔ اس طرح وہ گویا اپنی تجسیم کیلئے یا اپنے وجودی اظہار کیلئے نئے استعارے اور نئی علامتیں وضع کرتی ہیں۔ جب انسانی وجود کی اصل علامت اور استعارے معدوم ہو جائیں تو دوسرے استعاروں کی تلاش ایک امر فطری بن جاتی ہے۔ شبنم عشائی نے اپنے وجود کی استعاراتی تقلیب کے ذریعے یہ واضح کر دیا ہے کہ وجود کی جو حقیقی ماہیت اور اس کی حقیقی علامت ہے، اس کی گمشدگی یا اس کا انہدام ہی انسان کو دوسری راہیں شکلیں اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے:

اگر تمہارے ہزاروں پیڑوں میں سے/ ایک میں بھی ہوتی / ایک سال میں/ چھ پہرے، ایک کھاد/ اور تمہاری ہزاروں چاہت بھری نظریں/ مجھے نصیب ہوتیں اور تب/ دل سوگوار نہ ہوتا/ میری ہر ٹہنی/ تم اپنے ہاتھوں تراشتے/ میں سنور جاتی

وہ اپنی زندگی کو سی سی فس کی طرح لایعنی قرار دیتی ہیں:

میں چلتی رہتی ہوں/ چلتے چلتے میری ایڑیاں پھٹ گئی ہیں/سی سی فس کا فرض کب تک نبھاؤں گی

۳

شبنم عشائی کی شاعری نسانیت کا نوحہ بھی ہے، اور وہ 'نوا' بھی جس میں آگ بھری ہوئی ہے۔ یہ نسائی ذات کی وہ لمبی خاموشی ہے جو بول پڑی ہے۔شبنم کے شعور واحساس میں یہ بات اچھی طرح گھر کرگئی ہے کہ تابعداری، فرمانبرداری، ایثار ہی عورت کا مقدور اور مقدر ہے:

وہ جب پیدا ہوئی تھی/ اس کے کانوں میں/ تابعداری کی اذان دلوادی گئی تھی/ جب سے اب تک وہ/ تابع داری کرتی رہی!

....

ہوا سے پوچھتی ہوں/ ہوا میری رہائی کی تاریخ بھول گئی ہے/ مجھے اتنا یاد ہے/ کہ سارے کرب میری ذات تک محدود ہیں

زندگی کے جبری حالات اور تقدیر کی تابع داریوں نے شبنم عشائی میں مرگ کے احساس کو بھی زندہ کردیا ہے۔ یہ احساس اس وقت جنم لیتا ہے جب زندگی تمام تر عذابوں کے ساتھ ایک وجود پر مسلط ہوجائے اور وجود بے دیار، بے دل اور بے خانماں بن جائے:

مجھے سفر کرنے دو/ زمین کے کسی ٹکڑے پر/ پاؤں جمانے کیلئے نہیں/ موت کے انتظار کے لئے/ مجھے وہاں تک جانے دو/ جہاں چاندنی کے بستر پر/ ساعت گذشتہ میں ٹھہری ہوئی/ موت/ میری راہ دیکھ رہی ہے!

....

جب سے/ ڈھیر سارے دن گذر گئے/ میری موت/ شروع ہوئی تھی/ پہلی قسط میں تھا/ معصوم اعتبار/ جس کی موت نے/ رنگ چہرے کا/ چراغ آنکھوں کے/ دھندلا دیئے/ دوسری قسط میں تھا/ اعتقاد/ جس کی موت نے/ ساٹھ سال کا بنا ڈالا/ اور اب میں موت کی تیسری قسط کے انتظار میں بیٹھی/ دھول بھری زندگی گذار رہی ہوں۔

شبنم عشائی میں مرد معاشرے کے رویے نے ایک عجب سی بے اعتباری اور mistrust کا احساس پیدا کردیا ہے۔ اسی لئے ان کی نظموں میں مردانہ مکروفریب کے وہ سارے نقوش ملتے ہیں جس سے ایک عورت کی زندگی بانجھ بن جاتی ہے اور اس کے وجود سے اذیت لپٹ جاتی ہے:

تمہارے دوغلے پن نے/ میرے سپنوں کو/ بانجھ کر ڈالا/ میرے ہمراہ/ یہ بانجھ سپنے/ دربدر

کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں/ کتنی محفلوں میں لئے پھری ہوں انہیں/ میری آنکھیں/ مجھے محفل میں بیٹھا کر/ نئے سپنے ڈھونڈنے نکلتی ہیں/ پھر رات/ نیند کی گولی سے/ انہیں سپنے دیکھنے کا فریب دیتی ہوں/ سنو/ اس سے پہلے کہ میری آنکھیں/ کوئی سپنا چرا کے لائیں/ یا میں/ فریبی کہلاؤں/ تم اپنا ایک مقرر کرلو

یہ شاعری دو کرداروں کی تقطیب سے عبارت ہے۔ ایک فعال کردار ہے، اور ایک مفعول۔ فعال کردار کی شکل میں مرد کی ذات ابھرتی ہے جس کیلئے محبت محض بھوگ، ولاس ہے، جو صنعتی سماج کی محبت پہ یقین رکھتا ہے جو ہردے ہین ہوتا ہے اور انفعالی کردار کی صورت میں عورت کی ذات جس میں محبت کا کومل احساس ہوتا ہے، جو زرعی سماج کی محبت پہ یقین رکھتی ہے جس کے پاس ایک دھڑکتا ہوا پر سوز دل ہوتا ہے۔ ایک کے اندر سادیت پسندی ہے تو دوسرا ماسا کیت پسند ہے۔ ایک ایذا کوش ہے تو دوسرا ایذا دینے والا۔ دراصل یہی دو کردار بنیادی طور پر اس شاعری میں نمایاں ہیں اور ان دو کرداروں کی ذات سے ہی شاعری میں تناؤ اور تضاد کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ ماسا کیت پسند کردار کی تعبیر ان نظموں میں ہے:

....

تم تو فاصلوں کا خواب تھے/ (جو تم نے کبھی طے ہونے نہیں دیے) / اور میں پھر بھی/ تمہارا حرارت سے خالی ہاتھ تھامے/ اپنے وجود کا لمس/ لٹاتی ہوئی/ فاصلہ کم کرنے کی/ دیوانگی میں چلتی رہی

....

زندگی کی سگریٹ/ تمہارے ساتھ پینے کی خاطر/ میں نے اپنے سوچنے کی صلاحیت/ تمہارے نام کردی تھی/ اور وہ تمام مکھوٹے/ تمہارے کمرے میں سجا دیئے تھے/ جنہیں تم نے عمر بھر/ شکار کیا تھا/ میں اپنی ساری خوشبوئیں/ خرچ کرکے/ تمہارا پورا درد خرید رہی تھی/ لیکن تم نے آنکھوں پر ہی نہیں دماغ پر بھی پٹی باندھ رکھی تھی/ سڑک حادثے کے بعد/ میرا پلستر چڑھتے سمئے/ جو تم نے ایک لمحے کو/ اپنی آنکھوں کی پٹی کھول دی تھی/ تمہارا سر جھک گیا تھا!

....

اطلسی کمخواب/ مہندی، جھمکے، کنگن، گجرا سبھی رُلا دیئے تھے/ جب جھوٹ کی قینچی سے/ تم سچ کا

ریشم کتر رہے تھے/ میں بھی منڈپ میں بیٹھے/ سب کچھ دیکھ رہی تھی/ لیکن اپنا من/ تمہاری ہتھیلی پہ رکھتے سمئے/ بہت سالوہا/ میں نے اپنے سینے میں رکھ دیا تھا/ میں نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو بھی تو اُتار کر/ تمہیں دے دیا تھا/ اپنی سانسوں کو بھی تو کھول کر/ تمہیں اوڑھا دیا تھا

....

میں جسم پہ Telcum نہیں/ اپنے وجود پہ/ نمک چھڑکنا چاہتی ہوں/ صدیوں سے جمی ہوئی/ برف کاٹنا چاہتی ہوں/ کیا تم رشتوں کا الاؤ/ دہکا سکتے ہو؟/ میں اپنی آنکھوں کو/ آنسوؤں سے/ طلاق دلانا چاہتی ہوں جو صدیوں سے/ آنسو کاشت کر رہی ہیں/ کیا تم میری آنکھوں کو/ خواب دے سکتے ہو؟/ زمانے کے بکھیڑوں میں نہیں/ من کی دنیا میں/ گھر بنانا چاہتی ہوں/ بس اب میں/ دل کی بات سننا چاہتی ہوں/ کیا تم میرے من میں بول سکتے ہو

....

میں کسی آنکھ میں/ ٹھکانہ نہیں تمہاری کھوئی ہوئی/ نیندیں ڈھونڈنا چاہتی ہوں/ گھر کی چھت سے/ رہائی نہیں/ اس فرار میں جینا چاہتی ہوں/ جس میں تیری زندگی ہے

دوسرا کردار سادیت پسند ہے جس کی تعبیر یوں ہے:

وہ صرف ویسا کرتا/ جیسے وہ سوچتا/ لیکن رائے/ ہر شخص کی ضرور لیتا/ مشورہ اپنائیت کی علامت ہے لیکن/ مجھے خوف آتا ہے کچھ کہنے سے/ اس کے فیصلوں کی تلوار نے میری سوچ کو زخمی کر دیا ہے/ اب میری آنکھوں میں/ خواب نہیں اندیشے ہیں! / مجھے خوف آتا ہے کچھ کہنے سے/ میں ڈرتی ہوں کوئی میرے لفظوں سے مفہوم/ اور میری سوچوں سے خود آگہی/ چھین لے گا

....

وہ جو دوسروں کی دنیا کے/ خدا ہوتے ہیں/ ایک بدن کو/ نہ جانے کتنی قبروں میں/ بانٹ دیتے ہیں/ اور جب کبھی وہ/ اُن قبروں کے عذاب سے/ جاگتے ہیں/ زندگی کی/ آزاد سانوں میں/ زندہ خوابوں کو ہمکتا دیکھ کر/ اپنے اندر دھڑکنا/ چھوڑ دیتے ہیں/ اور پھر آہستہ سے/ اُنہی قبروں کی تہہ میں/ آ کر بیٹھ جاتے ہیں

....

تم بار بار/ جینے کی خاطر/ میری من کی مٹی میں/ موت کیوں بوتے ہو؟/ جو مٹی تخلیق کا دکھ سہتی

ہو/ بانجھ نہیں ہوتی!/ تم مجھ سے/ اور کتنی نظمیں لکھواؤ گے؟

....

محبت سے مربوط شبنم عشائی کی شاعری میں اس کیمیائی ردعمل کی شناخت بآسانی ہو جاتی ہے جسے فینا ئلے تھیلے مائن (Phenylethoylamine) کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں اس کیمیا کا تیز بہاؤ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ڈوپے مائن (Dopamine) اور ایڈرنیلن (Adrenalin) جیسے کیمیائی نظام سے ان کے تخلیقی نظام کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ کیمیکل اور ہارمونز کے امتزاج کی وجہ سے محبت کا دریا، موجزن اور مضطرب ہونے لگتا ہے اور اس کیمیائی اضطراب کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ہے۔ اس سے شبنم کے ذہنی نظام اور اس کے تحرکات کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے۔

ایرخ فرام کے نظریے سے اس شاعری کو دیکھا جائے تو اس میں تکفیلی وصل کی انفعالی صورت نظر آتی ہے۔ جب شاعرہ کسی ایک ذات کے جز کی حیثیت سے اپنی وابستگی چاہتی ہے یا اس کی ذات کا تتمہ بن جاتی ہے اور دوسری طرف مرد ایک سادیت پسند کے طور پر سامنے آتا ہے۔ دو مخالف قطبین کے مابین وصل کی ایک صورت بھی اس میں نمایاں ہے۔ سب سے بڑی چیز جو اس شاعری میں ہے وہ تقطیبی وصل ہے۔ یہ تقطیبی وصل ہی شبنم عشائی کو اپنی ذات سے آشنا کرتی ہے۔ باوجودیکہ شبنم کے یہاں لہجے میں زیادہ کرختگی نہیں ہے، پھر بھی کہیں کہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصل کی تلاش میں ان حدوں کو پار کرنا چاہتی ہیں جو حدیں تضاد کی طرف لے جاتی ہیں۔

مرد عورت کے تضاد میں وصل ہی اصل ہے اور اسی سے عورت مرد کی ذہنی اور نفسی حرکیات سے آگہی ہوتی ہے۔ شبنم عشائی کے یہ دو شعری کردار دراصل انسانی زندگی کی کیفیات کے مظہر ہیں۔ ایک طرف محبت کی فعالیت ہے، فعال لگاؤ ہے دوسری طرف مفعولیت اور بے توجہی ہے۔ ایک طرف محبت میں شدت ہے، دوسری طرف تشدد ہے۔ شبنم عشائی کے یہاں اسی لئے اس فردیت نے جنم لیا ہے جو لاتعلقی اور بیگانگی کا اشاریہ ہے۔ وہ اپنے اکیلے پن اور جدائی پر غلبہ پانے کی کوشش میں فطرت کی آغوش میں پناہ لیتی ہیں اور اس طور پہ اپنی فردیت کے عذاب سے نجات حاصل کرتی ہیں۔ مگر دراصل تلاش، ایک ہم آہنگی کی ہے۔ کائناتی شعور (cosmic consciousness) اور کائناتی توانائی (cosmic energy) کے وصال کی ہے جس سے وجود حقیقت اور اصل تک رسائی پا سکتا ہے اور یہ عورت، مرد کی مکمل خود سپردگی کے ذریعے ہی طے کی جا سکتی

ہے، عضویاتی ہم آہنگی یعنی منتھن کے بغیر اصل تک رسائی ناممکن ہے۔ پرش اور پراکرتی دونوں ایک ہی ہیں۔ اسطوری کہانی میں ہے کہ ابتداء میں مرد عورت ایک تھے، کاٹ کر انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ تبھی سے دونوں اپنے اپنے کھوئے ہوئے حصوں کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں کے وصل ہی سے کائنات کی ہم آہنگی جنم لیتی ہے اور یہی Oneness کائنات کا فینومینا ہے۔

مدھر بھکتی کے باوجود محبت میں فصل ہے، وصل نہیں۔ للا عارفہ کو آتما سم یوگم نصیب ہوا، مگر شبنم عشائی کو اپنے شعور کی گمشدگی اور محبوب کی ذات میں مکمل تحلیل کے باوجود محبت کا نورانی ہالہ نہیں ملا۔ رادھا کی طرح اپنی ذات کی نفی اور خود فراموشی کے باوجود بھی ''وصال'' اور True other نصیب نہیں ہوا۔

شبنم عشائی کی شاعری میں نسائی احساسات، جذبات اور ادراکات ہیں اور ان میں مثبتیت (positivism) بھی ہے۔ Auguste Comte کی طرح شبنم عشائی کی شاعری میں بھی جارحیت نہیں بلکہ معروضی انداز سے مسائل کو سمجھنے اور خود کو قربان کرنے کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان کا تعلق raunchy culture اور playboy bunny امیج میں اسیر female chaunist pig سے نہیں ہے۔

عورت اور مرد کے تفاعلات الگ ہیں۔ مرد معاشرے نے جس نسائی تفاعل کا تعین کیا ہے وہ غلط ہے۔ عورت محض pleasure اور Power کی غلام نہیں ہے اور نہ ہی وہ chattel status میں قید رہنا چاہتی ہے بلکہ اس کے دائرہ کار میں اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں۔ ان کے جذبات ان کی دھڑکیں ہیں۔ جب عورت کو خانگی اقدار اور امور میں قید کر دیا جاتا ہے تب بغاوت جنم لیتی ہے۔ جب اس سے space چھین لیا جاتا ہے تب باغیانہ جذبے کی نمود ہوتی ہے کیونکہ آج کی عورت ان سویا یا گندھاری بن کر نہیں رہ سکتی۔ وفا اور ایثار کی پیکر بن کر رہنا ہی اس کی زندگی کا مطلوب ومقصود نہیں ہے بلکہ اپنے Space کی تلاش بھی اس کی زندگی میں شامل ہے کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہی ہے کہ اس کیلئے تو چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا بھی ممنوع ہے۔ بقول سارہ شگفتہ عورت کی ریاست چادر کشائی تک محدود ہے اور اس کا وطن بدن سے زیادہ نہیں ہے۔ جب کہ مردوں کی خود مختاری کا رقبہ اس قدر وسیع ہے کہ اسے Polygamy تک کی مراعات حاصل ہے جب کہ عورت ایک ہی مرد کی 'اسیر زندانی' بن کر رہتی ہے۔ اس کیلئے Po!yandry ممنوع ومحظور ہے۔ مرد کی اس خود مختاری کے غلط استعمال سے عورت اور مرد کے مابین رشتے کے استحکام اور اعتبار پر منفی اثرات

پڑے ہیں اور دونوں کے مابین بے اعتمادی اور خلیج بڑھی ہے۔ اس لئے عورت ایسے تقطیبی نظام کے خلاف ہے بلکہ وہ تو پدرسری نظام کے بھی خلاف ہے۔ وہ اپنے ان حقوق کا مطالبہ کرتی ہے جو انہیں عطا کیا گیا ہے۔ حیاتیاتی اعتبار سے اس کا دائرۂ کار الگ ہے۔ مگر سماجی، سیاسی اور ذہنی تخلیقی اعتبار سے دونوں کے دائرۂ کار میں اشتراک ہے۔ شبنم عشائی کے یہاں بھی اس پدرسری نظام سے بغاوت ملتی ہے۔ مگر یہ بغاوت energetic ہے۔

عورت جس سماجی آزار کے بیچ زندگی گذارتی ہے، اس آزار سے نجات حاصل کرنے کی تمنا ہر ایک عورت میں ہوتی ہے۔ یہی آرزو، یہی خواہش، یہی تمنا اس شاعری میں بھی ہے۔ شبنم عشائی مرد کو متغائر نہیں بلکہ اپنے اصل کا ایک حصہ سمجھتی ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں اس کھوئے ہوئے حصے کی تلاش کا عمل سب سے زیادہ نمایاں ہے اور تلاش کے مرحلے میں جن اذیتوں سے دو چار ہوتی ہیں، ان اذیتوں کا اظہار بھی ہے۔

شبنم کی شاعری میں عشقیہ روایتی کردار کی تقلیب بھی ہے۔ روایتی اور کلاسکی شاعری میں مرد ہی مظلوم ہوتا تھا اور عورت ستم گر اور جفا شعار ہوتی تھی۔ یہاں معاملہ مقلوب ہے۔ عورت شہامت، شجاعت، فراخ دلی magnanimity کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے جب کہ مرد بزدل اور تنگ چشم کے طور پر روبرو ہوتا ہے۔ مرد، عورت کی جبلی، خلقی تقلیب بھی یہاں نمایاں ہے۔ ایک عورت مرد کی بیوفائیوں اور ان کی ستم گری کا بیان کرتی ہے۔ عشق کی یہ تقلیب نئے زمانے کی کیفیت کا غماز ہے اور نئے زمانے کے سواد راصل یہ اس زخمی روح کی داخلی داستان ہے جسے بار بار نیزۂ ستم سے چھلنی کیا جاتا ہے۔ دل کی بیتابی، آنکھوں کی بے خوابی اور تسکین اضطراب کی ایک ہی شکل ہے تخلیق مگر یہاں بھی عورت کو امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کا تخلیقی عمل اپنے وجود کے خلا (void of existence) کو بھرنے کی ایک کوشش بھر ہی تو ہے۔

یہ شبنم کی داخلی دنیا ہے، یہ لمحۂ حاضر کی شاعری ہے۔ دھیان کی، جہاں داخلی دنیا کا تحرک زیادہ ہے اور خارجی کائنات کا کم۔ دھیان کے ذریعہ شبنم عشائی باطنی دنیا کے epicentre تک پہنچ گئی ہیں۔ شبنم عشائی کی اس شاعری میں کہیں کہیں وہ طلسمی مقامات بھی آتے ہیں کہ قاری breathless ہو جاتا ہے۔ شبنم عشائی کی شاعری میں attractive molecules کی موجودگی، ان کی شاعری کو حسن کی تجسیم میں تبدیل کر دیتی ہے:

شبنم عشائی ماں کی گود میں
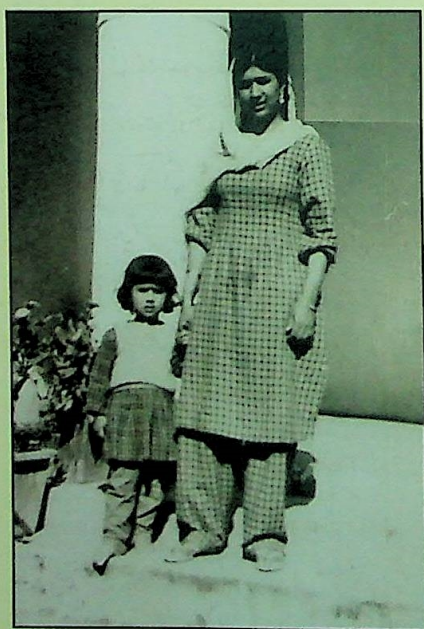
شبنم عشائی ماں کی انگلی پکڑے

شبنم عشائی بچپن میں (1967ء)

شبنم عشائی اب (2011ء لاہور)

لاؤ ذرا پہن لوں تمہیں/ تنہائی اُتار دی میں نے/ باہر کاریڈور میں پڑی سسک رہی ہے/ اپنے دھیمے لہجے میں/ وہ ساری داستانیں سناتی/ جنہیں سن کر میں دھیمی آنچ پر/ پہروں سلگتی تھی....../ لاؤ ذرا پہن لوں تمہیں/ وہ key hole سے جھانک رہی ہے/ جیسے ہم موقعہ پاتے ہی/ اپنے اصل میں جھانکتے ہیں/ اس سے پہلے کہ وہ مجھے ننگا دیکھ پائے/ لاؤ ایک دوسرے کی اصل میں/ شامل ہو جائیں/ میں اپنی ساری شبنم/ تمہاری پلکوں پہ گراتی ہوں/ تم میری سانسوں کی پگڈنڈی سے/ میرے اندر اُتر آؤ/ میں ڈھک جاؤں گی/ اپنی اصل کی اماں پاؤں گی/ لاؤ ذرا پہن لوں تمہیں/

....

میں نے ابھی تک/ اپنے سفر کا آغاز نہیں کیا/ لیکن بے شمار دکھ/ میری جان سے گذرتے رہے/ رقص کرتے رہے!/ اور وہ درد بھی جو میری ہمشیرہ نے/ ذبح ہوتے ہوئے/ میرا آنکھوں میں رکھ دیا تھا/ جب سے/ دُکھ جی رہی ہوں

....

لاتعلقی کے پانیوں میں/ ہم کب تک تیر سکتے ہیں/ تم میری آرزو/ پوری نہیں کر سکتے، نہ کرو/ مگر میرے دل کے اندر/ بولنا چھوڑ دو

....

شبنم عشائی کی شاعری ایسی ہے جیسے گورے چہرے پر سانوری آنکھیں۔ کبھی کبھی تو اس شاعری کے پیرہن پہ آنکھ بھی ٹھہر نہیں پاتی۔ یہ سرو قامت صنوبر شاعری دھیمی آنچ پر پہروں سلگتی رہتی ہے اور موتیوں کی لڑی سی بنتی جاتی ہے جس کا رشتہ آنسو اور درد سے ہے۔ مصحفی نے محبوب کی خوش قامتی پر ایک عمدہ شعر کہا تھا شبنم عشائی کی خوش قامت شاعری کے بارے میں یہ شعر صادق آتا ہے کہ شبنم کی شاعری ان کی شخصیت سے علیحدہ نہیں ہے:

بیٹھے بیٹھے جو ہو گیا وہ کھڑا
اِک ستارہ سا شب زمین سے اٹھا

شبنم کی شاعری میں ensnaring قوت ہے اور سچ پوچھئے تو اردو شاعری میں یہ ایک husky voice ہے۔ یہ perfect porcelain poetry ہے۔ شبنم عشائی مختلف لہجوں کی شاعرہ ہیں۔ کہیں کہیں ان کا imperious style ہوتا ہے تو کبھی اسکا low octave tone غضب ڈھاتا ہے۔

—— حقانی القاسمی (استعارہ)

Poetess from Kashmir Valley:

"Shri Vidya"—ICON WITH "WAVES OF BEAUTY"

Face to face with so versatile and sensitive poetess Dr. Shabnam Ashai, an evocative author also of so pertinent a scholastic MAGNUM OPUS on "Alienation—An Existentialist Concept", of great contemporary relevance for the present world in turmoil, one is instantly tempted to hail her in Shellyes's lyrical words:

Rarely, rarely comes –THOU;
SPIRIT OF DELIGHT -- !

As we delve deeper into so illuminating, analytical and perceptive interpretative contents of the unique philosophical treatise of poetess Shabnam, with so natural Eastern slant, on the complex genesis of Man's alienation from God and from his own self and the ultimate spiritual redemption of not only his physical but METAPHYSICAL ANGUISH, we feel naturally relieved and elevated too.

Under the Magical spell of her spiritual panacea, as one proceeds to surmount the

painful contradictions of the dominant existentialist philosophy of the twentieth centaury one naturally feels inclined to adore her as our ancient "SHRI VIDYA" spanning the energy fields of TIME and SPACE, with ultimate harmony of LIGHT and SOUND and ultimate consummation of UNIVERSAL CONCORD (COSMIC CONSCIOUSNESS).

I have a feeling that having acquired creative proficiency in quality Broadcasting (audio) and Telecasting (Visual) from the Srinagar center of Radio-Doordarshan in our Jammu and Kashmir region, besides having acquired vibrant, inspiring experiences through her ceaseless creative participation in several national and international level SAHITYA AKADEMI seminars on contemporary Urdu literature and special university level seminars on her own literary works, has enabled her to present to national and international literary world three outstanding anthologies of her own path-breaking spiritually surcharged Urdu poems, Her very first poetic anthology in Urdu "AKELI" (Lonely) Won for her a national award. The second anthology of Urdu poems "MAIN SOCHTI HOON" (So I think) just published with special goodwill assistance of SULABH INTERNATIONAL SAHITYA AKADEMI, New Delhi. Her, much enriched third anthology of poems "MAN-BANI" (MELODY OF MIND),

published in bilingual versions, Urdu as well as Hindi, by the Avant Grade Urdu literary Journal "ISTEARA", with fresh goodwill of SULAB INTERNATIONAL SAHITYA AKADEMI, New Delhi, has emerged as her literary landmark, a real BOUNTY from our own, "Dr. SHABNAM, is SHRI VIDYA" incarnate with ṇatural synthetic inheritance of KASHMIR SHAIVA TRANTRA and SUFI philosophy of Valley of her birth. She is thus fully competent to spontaneously pray for devout creative exuberance and ultimate redemption of us all in alienated suffering humanity:

MAY YOU SEE THE LIGHT THAT SOUND
PRODUCES;
As it travels through space!
MAY YOU HEAR THE SOUND THAT LIGHT
PROCUDES:
As it travels through space!

If we also are actually able to pray like this for all suffering humanity, including ourselves, then Alienation, with all its dark shades will gradually LOSE ALL ITS STING for us, enabling us to realize the inner harmony between JYOTI VINDU (The point of light) and NADA-VINDU (The Point of Sound) and glimpse and savour and BLISS ABSOLUTE OF COSMIC CONSCIOUNESS (UNIVERSAL CONCORD).

As we go ahead to enjoy the BLISS ABSOLUTE together with emergence of KNOWLEDGE ABSOLUTE from EXISTANCE ABSOLUTE in energy fields of SHRI VIDYA, the Science of physical and matephysical equilibrium, exemplified in Global verdant Philosophies of ADI SHANKERACHRIYA and SWAMI VIVEKANANDA and subtle KASHMIR SHAIVA TANTRA of creative path-finders like Achriya Abhinava Gupta and Sufi saint poets like Sheikh Nooruddin we will instantly realize how even Today's sadder blood stained Kashmir valley, capped by the Upper Himalayas of the Amarnath caves, is capable of fleshing the

beaconlight of HARMONIOUS UNIVERSAL CONCORD (COSMIC CONSCIOUSNESS) through her young talented poet-philosophers like Dr. Shabnam Ashai.

Having already established herself as an icon of SHRI VIDYA with all the WAVES OF BEAUTY, Dr. Ashai, Kashmir's DIVINE DEW-DROP, has unique mystic charm to adorn the lap of MOTHER SARASWATI (SHARDA) since quite long. As a celestially blessed Angel from the hallowed rainbow land of Saraswati and Supreme MOTHER SHAKTI, sometimes in her super-conscious imagination, she condescends to bless our literary and aesthetic "MEDITATION HUT" with her manifest form of SOUL-MATE.

In such blessed moments of soulful meditation, after our triumph over vagrant musing, pain and passion of alienation, under her mystic luminous spell, we may sometimes hear SHRI VIDYA, our DIVINE MINSTREL's MUSICAL ECHOES from beyond our "meditation hut", beckoning us to look inward, to identify SHAKTI our supreme soul-mate, beyond Time and Space:

Lonely soul, have you met the charming woman, the Divine feminine force of Entire Universe, who shares your chamber, Lonely Soul. She is beyond description. All the sparks that fly in you, Will, knowledge, action, emotion experience, percept, concept, Love, Light and

Truth are specks of dust at that woman's feet. As she returns from her Cosmic journeys, she returns for love of you.

The lord gathers that dust from her feet, throws it into empty space and lo, the myriad Suns and stars become satellites of earth, like so many musical notes. Have you counted the shades of colors of the rays, that emanate from a toe nail of her left foot? She wriggles her toe and a tiny ray, you, return to rest at her feet. Her music calls and you mediate.

I wish you this day a glimpse of the light in this inner woman's eyes.

I wish for you a BAPTISMAL IMMERSION in a WAVE OF BEAUTY of your own fulfilled itself.

I am immensely indebted to Swami Veda Bharti, spiritual successor to legendary Swami Rama of SADHANA MANDIR of Rishikesh in sacred Ganga valley of Uttarakhand Himalayas for mystic musical strains of ADI SHANKARACHARYA's "SAUNDARYA LAHARI" (Waves of beauty), embedded in the above celestially resonant metaphysical invocation, heard by me, a humble devotee of SHRI VIDYA in my inner MEDITATION HUT. Actually, in the heart of our alienated hearts, we in our devout dedicated moments, can hear the mystic strains of SHAKTI invocation with our own agony and ecstasy, in our inner Chamber anywhere, from Rishikesh valley of Uttarakhand to Kailash

Mansarovar, in higher central Himalayas – the eternal Abode of SHIVA and SHAKTI, the Supreme Guardians of the entire Universe, beyond all racial and religious barriers and national and continental divideds.

In fact, with all humility, Poetess Dr. SHABNAM in her philosophical treatise on Alienation and existentialism, had at the very beginning spotlighted the grim reality that "Men today are estranged from others as well as from themselves. But "Others" means not only the social communities in which they live: it also refers to the NATURAL and SUPERNATURAL words beyond." She has already expressed this universal ALIENATION ANGUISH in one of her relevant poems, included as a creative tear-soaked gem in her latest philosophical treatise:

The night kept descending
I stared at the falling stars
The silver streams
Flowed down the mountains
Fading in darkness.
The constellation of stars
Adorned the world and dissolved,
And the MOON BOWED DOWN
To kiss the cold forehead.
The horizon darkened even deeper,
I kept lying for long
Without a breath, a notion,
And memory kept enveloping my being

With the dead leaves of fallen flowers

Dr. Shabnam Ashai, even in her philosophical treatise has rightly recalled that Globally renowned icons of existentialist movement, like Sartre and Camus, realized " Man feels himself condemned to be free" and that " Man has to fight injustice of man to man". Camus further insisted that an authentic revolt against the human condition has to be a revolt in the name of solidarity of man with man. Yet as a poet and thinker from the East, Dr, Ashai has gone ahead to remind us of the eternal potentiality of Lord Buddha's Compassion and Prophetic Poet Iqbal's Universal Love in making man really FREE and HAPPY.

—JITENDRA SINGH
Former "Times of India' Special Representative
And Editor "Gandhians in Action" International
Journal.

Shabnam's "Manbaani",
a Collection of Poems

Man Baani is Shabnam Ashai's first and robust collection of poems that, I believe, is impressive on two counts. One, she has not taken the path of the traditional Urdu poet of either sex who writes ghazals with traditional meanings, words and imagery. The lover and the lvoer's world view in traditional poetry has remained unchanged for centuries. The nazam, however, did try to change that scenario but on the whole remained under the influence of the same traditional imagery and meanings. But Shabnam is without doubt one of those new poets who have tried to completely break away from the traditional mode of expression. The second distinction is her intense and focused stance as a feminine voice expressing with powerful language her discontent with the male dominated relationships. She uses fearless but at the same time elegant language.

Her poems in this collection, a continuum of soliloquies, is witness to her talent –the powerful expression of intricate feelings of relationships

in a fresh, thoughtful and reflective language. It's a saga of being. It's a woman's reflection on relationships. It's not a confrontation but a narrative full of questions without whose answers it's endlessly reinventing itself poem after poem.

—Muneeber Rahman
Blitranslations
Boston

"Man Baani"

The anthology of poems "Man-Bani" (Melody of Mind), is a very individualistic and philosophical journey of the mind of the talented poetess of modern times, Dr. Shabnam Ashai. Her poetry gives a message – the alienated man drifting and moaning in the wilderness of confusion, can find a meaning amidst all the absurdities of life if he cultivates union with nature and divine. The remarkable clarity of expression and chaste diction lend a spectoral kind of smoothness to her verse existentialist philosophy has gone into the mind of her scores of poems. Her poetry can be enjoyed by anyone who is interested in reading Urdu poetry.

Dr. Ashai's muse is in alliance with high seriousness as that the poetess wants a therapentic release from the stress on the mind by giving an outlet to the pentup emotions. The body does not need talcum but she wants to sprinkle salt on her naked self- the existing self. Under such circumstances age old tears become tormenting and she wants to divorce them-but even that is not easy. She craves for hopes and dreams in her eyes and she wants to build a sanctuary in the hidden recesses of her mind, away from the trials and tribulations of the world, just to listen to the

voice of her own conscience. It is a place where she would court her Muse, where she is aware of light and dark, feelings of depression and of blessedness, but ultimately finding peace within.

It is not the poetess who is moving from one stage to other but it is the development of one idea into other, the movement and growth of ideas. Personal agony, sorrow, seclusion and loneliness are depicted with great skill and competence. The use of irony and metaphor make her poetry all the more impressive. Draping herself in the loneliness, she finds it as the reality of life. Love of Delhi is compared to the balloons being sold at night on the roads which get deflated by the one reached home at midnight. Passions of love also cool down but the mind is crazy, which is not ready to accept the reality, Her soul, her mind is like a grave – yard, having the darkness of the grave, as life for her is like a living death. There is a dialogue between "you" and "I". between Ashai's projected self and the soul. She has always been introspective, not even at any place she indulges in self eulogizing. On the contrary, she is aware of the stony rubbish of the values of the modern society symbolizing spiritual barronness and how difficult it becomes for a man to rise above these decrepit values and instabilities. She has struggled hard to come to terms with the self

amidst paradoxes and incongruities of life, and ultimately realizes that darkness and light, Godly and unGodly, truth and falsehood are the two sides of human reality.

Dr. Ashai is a conscious artist who is very much alive to the contemporary Indian situations. Her poetic sensibilities operate more in terms of the land-scape of the mind. Resulting in an ironic observation of reality in the external world. Her poetic corpus is very wide and can stand comparison with any great poet of her times. For Keats, poetry should be as natural as leaves to a tree and poetry come to Dr. Ashai exactly in the same way as leaves to a tree. Her poetry is indeed veritable page from life and she has made a substantial contribution to the canon of Urdu poetry.

—T.S. CHAWLA
BARRICADE

شبنم سے ——— بہت پیار

روشنائی سے تم
اپنی تنہائی گوندھتے گوندھتے
بھول جاتی ہو روٹی پکانا
پھر اوڑھ کے عقیدت کی چادر
چڑھنے لگتی ہو زینے
مخدوم صاحب کے مزار کے
رت جگے کے پالنے میں
جھولتی ہے کالی سیاہی
اپنی چمڑی ادھیڑ کر بناتی ہو
نظم کی قندیل۔
لفظ بن کر
تم عریاں ہو جاتی ہو نظم میں
سچ کی طرح
تیری نظمیں
شدید اقرار نامہ ہے
اپنی ذات کا

Man Mein jami Barf

Dr. Shabnam Ishai

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 978-93-81029-37-4